دبستاں

شمارۂ غالب

غالب



ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

دبستان

(شمارۂ غالب)

گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج

وحدت روڈ ۔ لاہور

سرپرست :

۶ - ریختہ پروفیسر حافظ منظورالحق عثمانی (پرنسپل)

ادارہ :

افسر حسین رضوی

عمر فیضی

جاوید احمد خاں (سال دوم)

*

جولائی ۱۹۶۹ء

بوئے گل

(مقالات)

صفحہ	مضامین	
۳ ...	مولانا غلام رسول مہر	۱ - مرزا غالب کی والدۂ ماجدہ — ایک ضروری سوال
۷ ...	ڈاکٹر سید عبداللہ	۲ - غالب
۹ ...	سید عابد علی عابد	۳ - کچھ غالب کے بارے میں
۱۲ ...	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۴ - مطالعۂ غالب کے بنیادی مسائل
۱۷ ...	پروفیسر سید وقار عظیم	۵ - غالب اپنے معاصرین کی نظر میں
۲۶ ...	ڈاکٹر وزیرالحسن عابدی	۶ - ریختہ رشک فارسی
۳۷ ...	ڈاکٹر محمد اجملی	۷ - غالب کا ذوق سفر
۵۱ ...	ڈاکٹر وحید قریشی	۸ - غالب کا ایک شعر
۵۶ ...	مولانا سعید اکبر آبادی	۹ - غالب ، حالی اور اقبال
۵۸ ...	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۱۰ - غالب کی شاعری میں جمالیاتی پہلو
۶۲ ...	پروفیسر یوسف جمال انصاری	۱۱ - غالب غمگین اور فلسفۂ رشک

★

نالۂ دل

(رشحات غالب)

دود چراغ محفل

(نذر غالب)

نظم

غزلیات — (غالب کی زمینوں میں)

مطبع لائن پریس - ہسپتال روڈ ، لاہور

پیغام

از جانب جناب عبداللطیف ملک صاحب

سیکرٹری تعلیمات ، مغربی پاکستان ، لاھور

غالب ھماری ادبی اور ثقافتی روایت کا نہایت اھم حصہ ھیں ۔ انکی عظمت نہ صرف موجودہ بلکہ آئندہ زمانہ میں بھی تسلیم کی جاتی رہے گی اسلئے کہ غالب کی شاعری بدلتے ہوئے عصری تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔

غالب کا مطالعہ نہ صرف شخصیت کی تعمیر کرتا ہے بلکہ پڑھنے والے میں بالغ نظری اور وسیع المشربی بھی پیدا کرتا ھے ۔

گورنمنٹ انٹر کالج وحدت روڈ اپنے میگزین "دبستان" کا غالب نمبر نکال کر اپنی دس سالہ ادبی روایت میں ایک درخشاں باب کا اضافہ کر رہا ھے ۔

اس شمارے میں جن اہل قلم کے مضامین شامل ھیں ان سے کالج کے پرنسپل اور ادارۂ "دبستان" کی ادبی کاوش اور حسن انتخاب کی نشاندھی ھوتی ہے ۔ کالج کے ارباب تدریس طالب علموں میں جس تخلیقی ذوق اور جمالیاتی حس کو بیدار کرنے کے لئے کوشاں ھیں وہ انکے خلوص مقصد اور شوق تعلیم کا آئینہ دار ھے ۔ مجھے یقین ھے کہ گورنمنٹ کالج کی یہ کوشش غالب فہمی میں مددگار ھوگی ۔

Prof. MIAN NAMDAR KHAN,
T. Pk.
Director of Education,
Lahore.

Directorate of Education,
Lahore Region,
Lahore.

پیغام

مجھے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی ہے کہ گورنمنٹ انٹر کالج وحدت کالونی لاہور اپنے مجلہ ''دبستان،، کا غالب نمبر شائع کر رہا ھے ۔ اس سال کے آغاز میں مرزا غالب کی صد سالہ برسی کے جشن، بڑے احترام و اہتمام کے ساتھ منائے گئے ۔ یہ ادبی محفلیں صرف برصغیر پاک و ہند تک محدود نہیں تھیں بلکہ باہر کے ممالک میں بھی اس ادیب ، عظیم شاعر اور فنکار کو خراج عقیدت پیش کرنے کا اہتمام کیا گیا ۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ھے ۔ جس سے مرزا غالب کی بین الاقوامی شخصیت اور عظمت کی نشان دھی ہوتی ہے ۔

مرزا غالب کے افکار و اشعار، دنیائے ادب کے جدید تقاضوں کے آئنہ دار ھیں اور ان کا مطالعہ نئی نسل کی ذھنی تشکیل و تہذیب کے لئے ناگزیر ہے ۔ امید ھے '' دبستان ،، کا یہ شمارہ اس سلسلے میں بہت مفید ثابت ہو گا ۔

نامدار خان

D. O. No.
GOVERNMENT OF WEST PAKISTAN
EDUCATION DEPARTMENT,
LAHORE

۷ جولائی ۶۹ء

پیغام

از جانب جناب یوسف جمال صاحب

ڈپٹی سیکریٹری تعلیمات، مغربی پاکستان ۔ لاہور

محترمی! تسلیم

چند روز ہوئے افسر رضوی صاحب میرے دفتر تشریف لائے اور مجھے نوید ہوئی کہ گورنمنٹ کالج وحدت روڈ کے لوگ بھی غالب نمبر نکال رہے ہیں۔ ظاہر ہے بہت خوشی ہوئی اور میں نے انہیں مبارکباد پیش کی ۔ لیکن جب انہوں نے فرمایا کہ اس ضمن میں چند سطور میں بھی تحریر کروں تو ایک دم کم مائیگی کا اتنا شدید احساس ہوا کہ واماندگیٔ شوق پناہیں ڈھونڈنے لگی ۔

پھر اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یاد آئی جو حال میں ایک اور تعلیمی ادارے کے مجلے کے غالب نمبر میں کسی نے لکھی ۔ جملہ کچھ یوں تھا کہ غالب پہ قلم اٹھاتے وقت بعض لوگ تو ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہیں اور بعض غیر ذمہ داری کا ۔ میرا خیال ہے کہ یوں بھی ان دنوں اہل قلم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ ایک وہ جو صرف فرشتوں کے لکھے پر پکڑے جائیں گے اور دوسرے وہ جو ساتھ ساتھ اپنے لکھے پر بھی ۔

بہر حال میں کسی ایسے جرم کا ارتکاب کرنے کے لئے تیار نہیں تھا چاہے افسر رضوی صاحب دم تحریر موجود ہوں یا نہ ہوں ۔ چنانچہ چند اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ چلے گئے تو تسکین ہوئی ۔

لیکن اسے کیا کہئیے کہ دو چار دن ہوئے موصوف پرانا مطالبہ دھرانے کے لئے پھر تشریف لے آئے ۔ اس بار قسمت نے یاوری کی اور مجھے ایک راہ فرار نظر آ گئی ۔ ہوا یوں کہ رضوی صاحب کے وعدہٗ فردا لے کر جانے کے بعد ایک دوست تشریف لائے جو اول الذکر کی طرح شاعر یا ادیب تو نہیں ہیں لیکن شعر و ادب کی دنیا سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں ۔ کہہ لیجئے کہ سخن فہم ہیں ۔ شاید غالب کے طرفدار بھی ہوں ۔ میں نے موصوف سے کہا کہ صاحب یہ بتائیے کہ ان دنوں ہمارے ادیب اور دانشور غالب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کیا کر رہے ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ لائق تحسین یا کم از کم لائق تسکین ہے یا نہیں ۔ انہوں نے میرے تفصیل طلب سوال کو ٹالتے ہوئے جواب دیا کہ ان سب باتوں کو تو ہٹائیے ۔ صاحب ! میرا اپنے ملک کے ادیبوں اور دانشوروں سے صرف ایک ہی مطالبہ ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس ملک میں ایک ایسا ہمہ وقتی ادارہ قائم کریں جو سنجیدگی سے غالب پر تحقیقی کام کرے اور (ہر چند کہ اس عظیم انسان کو ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ نہیں تھی) اس کے کلام کو مجموعی پس منظر میں دنیا کے سامنے پیش کر کے ہی دم لے ۔

یہ بات انہوں نے بڑے خلوص اور جذبہ کے ساتھ صرف مجھ سے کہی تھی لیکن ایسا سرگوشی کا ماحول بھی کیا ! میں اس وقت آپ سے کہے دیتا ہوں ، اور آپ اپنے جریدے کے توسل سے ببانگ دھل سب سے کہہ دیجئے ۔ شاید آپ کی اپیل کا درد اور سوز کام آ جائے ۔

BOARD OF INTERMEDIATE AND SECONDARY EDUCATION,
LAHORE.

CHAIRMAN
PHONE ; 68394

86-MOZANG ROAD
LAHORE.

D.O.No.3563 P.A./C
May 22, 1969.

My dear Usmani Sahib.

It is indeed gratifying to note that your college is going to publish a SPECIAL NUMBER to commemorate the 100th anniversary of Ghalib. I hope that the SPECIAL NUMBER will contain very useful information about the life and the art of the great poet. How far I may succeed in my attempt at delineating his art, is a question to which I find no suitably worded answer.

2. Ghalib was a born poet with sterling qualities of head and heart. He is essentially the last of the great classic poets of the Indo-Pakistan sub-continent. The greatest poet of his time. Ghalib is a master of art, both sound and solid; delicate and perfect. His works, both in Urdu and Persian, will continue to be a source of great inspiration for the posterity.

Wishing you all success in bringing out a valuable edition of THE DABISTAN.

Yours sincerely,

Sd/-
(Dr. S.M.H. Jafri)

Hafiz Manzoor-ul-Haq Usmani,
Principal,
Government Intermediate College,
Wahdat Road,
LAHORE-18.

PROF. IFTIKHAR ALI,
W.P.E.S. (I) Sr.
Deputy Director of Education
(Colleges).

Directorate of Edacation,
Lahore Region,
Lahore.

میرے عزیز دوست پروفیسر حافظ منظورالحق عثمانی ، پرنسپل ، گورنمنٹ انٹر کالج ، وحدت روڈ نے مجھ سے کالج کے مجلہ ''دبستان،، کے غالب نمبر کے لیے پیغام کی فرمائش کی ہے ۔ عنوانات کی فہرست دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے نامور اہل قلم کے مضامین اس شمارے میں شامل ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ ''دبستان،، کا غالب نمبر ''غالبیات،، کے سلسلہ میں ایک اہم اضافہ ہوگا ۔ پروفیسر عثمانی صاحب خود بھی ایک بلند پایہ ادیب اور فارسی کے عالم ہیں ۔ وہ اس سے پیشتر حکومت پاکستان کے مشہور جریدے ''ہلال،، کے مدیر رہ چکے ہیں ۔ ''دبستان،، کے اس خاص شمارے کی ترتیب و تدوین میں یقیناً ان کے مشورے شامل رہے ہوں گے ۔

غالب دنیا کے عظیم شاعروں کی صف میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں ۔ ان کی صد سالہ برسی عالمی سطح پر منائی گئی ہے ۔ ان کے فکر و فن پر مشہور نقادوں کی بلند پایہ تصانیف شائع ہوئی ہیں اور رسائل نے اس موقعے پر خاص نمبروں کا اہتمام کیا ہے ۔ مگر لاہور ریجن کے گورنمنٹ کالجوں میں ابھی تک ''راوی کے بعد غالب نمبر نکالنے کا شرف صرف ''دبستان،، کو حاصل ہوا ہے ۔ غالب کی شاعری اس بر صغیر کے مسلمانوں کی ثقافت کا حصہ ہے اس لئے نئی نسل کو غالب سے روشناس کرانے کے لئے تعلیمی اداروں کو اپنا فرض ادا کرنا چاہئے ۔

میں پروفیسر حافظ منظورالحق عثمانی اور ادارۂ ''دبستان،، کو اس مستحسن اقدام پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ عثمانی صاحب کی سربراہی میں گورنمنٹ انٹر کالج وحدت روڈ میں ایک ایسی علمی اور ادبی فضا پیدا ہو جائے گی جو دوسرے تعلیمی اداروں کے لئے قابل تقلید ہو گی ۔

افتخار علی
ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیمات (کالجز) :
لاہور ریجن

مجلس ادارت



دائیں سے بائیں : ۱ - عمر فیضی - ایم - اے (مدیر حصہ اردو) ۲ - افسر رضوی - ایم - اے (مدیر حصہ اردو) ۳ - جاوید احمد خان (طالب علم مدیر)

۴ - پروفیسر حافظ منظورالحق عثمانی (پرنسپل) ۵ - شیخ کریم الدین - ایم - اے (مدیر حصہ انگریزی) ۶ - افتخار باجوہ - ایم - اے (مدیر حصہ انگریزی)

گذارش احوال

یہ حسن اتفاق ہے کہ نئی تعلیمی تجاویز کی اشاعت کے ساتھ ھی ھمارا 'شمارہ غالب' منظر عام پر آ رہا ہے ۔ نئی تعلیمی تجاویز کی رو سے پاکستان میں اردو کا مستقبل تابناک ھے ۔ اکثر تجاویز امید افزا ھیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں حکومت کا ارادہ نیک اور عزم راسخ ھے ۔

قومی زبان کو اپنانے کے خوش آیند اعلان تو پہلے بھی کئی بار ھوئے مگر

ع سر بر ھوئی نہ وعدہ صبر آزما سے عمر

اب معلوم ھوتا ہے اہل حکومت کا دل گداختہ ھے ۔ فروغ زبان کا حسن انکی آنکھوں میں ھے ۔ حالیہ اعلان کے مطابق ۱۹۷۸ء تک اردو قومی زبان کے اصلی منصب کو پہونچ جائیگی——وہ اردو جسکے ولی عاشق تھے ، جسے میر نے رتبہ کو پہونچایا ، جسمیں درد نے معرفت کے بیج بوئے ، جسے انیس نے 'بات میں آسمان کر دیا' ، جسے غالب نے (محدود دائرے ھی میں سہی) رشک فارسی بنایا ، جسکی دھوم سارے ھندوستان میں داغ سے ھوئی اور جس کے گیسوؤں میں اقبال نے شانہ کیا ۔ لیکن غالب کا منفرد احسان یہ ھے کہ انھوں نے شعوری طور پر اردو نظم و نثر دونوں میں نئے اسالیب ایجاد کئے اور ھر قسم کے مضامین کے لئے ممکن الاظہار بنایا ۔

غالب کی سب سے بڑی خوبی ، ھمارے خیال میں ، ان کی انسان دوستی ھے اسی میں ان کی بلند نظری ، وسیع القلبی اور وسیع المشربی کا راز پنہاں ہے ۔ غالب اپنے کو پکا مسلمان کہتے تھے اور یہ دین اسلام کا عشق ھی تھا کہ وہ ھر قسم کی فرقہ بندی سے بالا تر ھو کر جئے ۔

ایک واقعہ ہے کہ ہمارے رسول ایک غزوہ پر جانے کو تیار ہیں ، سواری حاضر ہے ۔ ایک پیر رکاب میں رکھ چکے ہیں ۔ ایسے نازک اور اہم وقت میں ایک بدو حاضر ہو کر کہتا ہے : اے خدا کے رسول ! بس اتنی دیر میں کہ دوسرا پیر دوسری رکاب میں جائے مجھے پورا دین تعلیم فرما دیجئے اسلام لے آؤں گا ۔ مہم ایسی کہ غزوہ ۔ سوال ایسا کہ پورا قرآن اور فرض ایسا کہ رسالت ۔ صاحب وحی نے بلا توقف اور بلا تردد دوسرا پیر رکاب میں لے جاتے ہوئے فرمایا : ” الطاعت للخالق و الشفقت علی المخلوق ،، (اللہ کی اطاعت اور مخلوق سے شفقت) ۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ غالب نے اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد رسول کے ارشاد کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالا اس لئے کہ بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنکی خلقت ہی میں آفاقی محبت ودیعت ہوتی ہے لیکن اس کا ہمیں یقین ہے کہ غالب اس بات کے عالم تھے اور دین کی اسی روح کو حرز جاں بنائے ہوئے تھے ۔ یہی روح انسانیت ہے جس نے غالب سے ایسے شعر کہلوائے :

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

ایسے ہی اشعار کی بنا پر جب تک انسانی معاشرہ قائم ہے غالب کی آفاقیت مسلم ہے اور علم و ادب کی جتنی ترقی ہوگی غالب اقوام عالم کا اتنا ہی محبوب بنے گا ۔ غالب روشناس خلق ہے اور ہوتا جائیگا ۔

ایسے محسن ادب کی یاد منا کر ہم محض اپنا فرض ادا کر رہے ہیں ۔ محسن کے احسان کو یاد رکھنا شرافت ، نشانی ہے ۔

اس سلسلہ میں شمارۂ غالب کے لئے ہم اپنی محبت و عقیدت کا حق لئے ہوئے جس صاحب قلم کے پاس گئے مایوس نہیں لوٹے ۔ البتہ چند کے در دولت کے کئی پھیرے واجب آئے ۔ کوئی بہت تعویق پسند ہوا تو ہم نے رشید احمد صدیقی

کا یہ بیان سنا دیا کہ حشر کے دن میرا دامن پکڑنے والوں میں اگر کوئی ہوا تو اخبار و رسائل کے مدیر پہلی صف میں ہونگے چنانچہ یوم حساب سے ڈر کر اس خوش بخت نے بھی ہم سے یہیں اپنا دامن چھڑا لیا ۔

سچ یہ ہے کہ غالب نمبر کی اس فصل میں ان صاحبان قلم کو بیس بیس مضمون اور غزلوں کے لکھنے میں تردد کرنا پڑا مستزاد یہ کہ انکی داتی و منصبی مصروفیتوں کے سیلاب میں ایک لمحے کی فراغت بھی عنقا تھی لیکن ان غالب شناسوں کا احسان تھا کہ اپنے فیض فکر و جود قلم سے نوازنے میں سخاوت سے کام لیا ۔ ہم ان اہل قلم کے شکر گذار اور "دبستان" کے صفحے ان کے افکار سے آبدار ہیں ۔

بعض احباب نے ہم سے کہا کہ آپ لوگوں نے شمارۂ غالب کی اشاعت میں بڑی دیر کر دی ۔ جواب میں ہم نے غالب کا یہ مصرع پیش نہیں کیا

ع 'ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا'

اسلئے کہ غالب پر جو بھی اور جب تک کام کیا جائے تاخیر کے زمرے میں نہیں آتا ۔ غالب کی برسی کا دن ہی غالب پر کام کرنے کی اول و آخر تاریخ نہیں ہے ۔ غالب کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام وہ کام ہے کہ زندگی کے ساتھ بھی تمام نہ ہو اور کہنا پڑے :

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ادارہ

بوئے گل

میرزا غالب کی والدہ ماجدہ

ایک ضروری سوال

میرزا غالب کے دادا قوقان بیگ خاں کے تین بیٹیاں تھیں اور چار بیٹے۔ بیٹوں میں سے ہمیں صرف دو کے نام معلوم ہیں: اول میرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں جن کی وفات ۱۸۰۲ء میں ہوئی۔ دوسرے میرزا نصراللہ بیگ خاں، جو ۱۸۰۶ء میں گھر سے ہاتھی پر سوار ہو کر نکلے تھے، اچانک سواری سے گر کر فوت ہو گئے۔ میرزا کے باقی دو چچاؤں کے نہ نام معلوم ہیں اور نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کب ان کا انتقال ہوا۔ اندازہ یہ ہے کہ وہ ۱۸۰۲ء سے پیشتر ہی مر چکے تھے۔

پنشن کے کاغذات سے واضح ہوتا ہے کہ نصراللہ بیگ خاں کے پس ماندوں کے لیے جو پنشن مقرر ہوئی تھی اس میں سے نواب احمد بخش خاں مرحوم کی قطع و برید کے بعد، جس کی کوئی وجہ ذہن میں نہیں آتی، تین ہزار روپے بچے تھے جن میں سے ڈیڑھ ہزار روپے نصراللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنوں کے لئے تھے۔ بقیہ ڈیڑھ ہزار روپے نصراللہ بیگ خاں کے بھتیجوں کے لئے تھے۔

ددھیالی اقربا: غرض والد کی وفات کے بعد میرزا کے ددھیالی اقربا میں سے دادی کے علاوہ تین پھوپھیاں تھیں۔ ایک بہن تھی۔ جو میرزا غالب سے اتنی بڑی تھی کہ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے پنشن کے کاغذات میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ ایک بھائی تھا یعنی میرزا یوسف خاں، جس کے متعلق غالب نے ایک غزل کے مقطع میں کہا تھا:

دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالب یوسف ثانی مجھے

"از سر نو زندگی"، اس لیے کہا کہ میرزا یوسف خاں خاصی مدت تک دیوانگی میں مبتلا رہنے کے بعد تندرست ہوئے تھے ۔ لیکن کچھ عرصہ تندرست رہ کر دیوانگی کا مرض پھر عود کر آیا یہاں تک کہ اسی حالت میں انھوں نے بہ زمانہ "غدر" وفات پائی (۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء)

میرزا کی والدہ ماجدہ : میرزا کی والدہ ماجدہ کا نام عزت‌النساء بیگم تھا ۔ وہ خواجہ غلام حسین کمیدان کی صاحبزادی تھیں ۔ جو آگرہ کے اکابر رؤسا میں سے تھے ۔ عزت‌النساء بیگم اتنی تعلیم یافتہ ضرور تھیں کہ دستاویزیں پڑھ کر دستخط فرما سکتی تھیں ۔

میرزا غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب‌الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے جمع کئے ہوئے نوادر میں سے تھا جو رسالہ "زمانہ" (جولائی ۱۹۳۶ء) میں چھپ بھی گیا تھا ۔ یہ خدا داد خاں اور اس کے بیٹے ولی داد خاں کے نام تھا جو آگرہ میں غالباً ساہوکارے کا کاروبار کر رہے تھے اور میرزا غالب کے خاندان کا بھی ان سے لین دین تھا ۔ میرزا نے انھیں لکھا تھا کہ میری والدہ پڑھی لکھی ہیں ۔ جس دستاویز پر ان کے دستخط ہوں گے ، صرف وہ مستند مانی جائے گی ۔ قیاس ہے کہ یہ خط ۱۸۲۴ء میں لکھا گیا تھا اور اس پر میرزا کی جو مہر ثبت تھی ، وہ ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) کی بنی ہوئی تھی ۔

اس خط سے واضح ہے کہ ۱۸۲۴ء تک میرزا کی والدہ ماجدہ زندہ تھیں ۔ اس وقت سے پیشتر بھی میرزا کی خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا ۔ وہ پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ گئے ۔ واپس آ کر بھی خط و کتابت کا وسیع سلسلہ جاری رکھا ۔ لیکن کسی خط میں والدہ کی وفات کا کوئی ذکر نہیں آیا اور میرزا معمول کے مطابق آگرہ جاتے آتے بھی رہے ۔

والدہ کی طرف سے مالی امداد : والدہ ماجدہ آگرہ سے کوئی نہ کوئی رقم میرزا غالب کو بھیجتی رہتی تھیں کیونکہ انھیں اپنے والد کی جائداد سے خاص حصہ ملا ہوگا ۔ میرزا نے نواب علاءالدین احمد خاں کے نام ۲۸ جولائی ۱۸۶۲ء کے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ بھائی (یعنی امین‌الدین احمد خاں والیٔ لوہارو) سے کہنا :

"صاحب! وہ زمانہ نہیں ، ادھر متھرا داس سے قرض لیا۔ آدھر درباری مل کو مارا۔ ادھر خوب چند چین سنگھ کی کوٹھی لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود ، شہد لگائے چاٹو ، نہ مول ، نہ سود - - - - - - - - - بایں همه کبھی خان (غالباً نواب احمد بخش خاں) نے کچھ دے دیا ۔ کبھی الور سے کچھ دلوا دیا ۔ کبھی ماں نے آگرہ سے کچھ بھیج دیا - - - - - -"

مجھے میرزا کی تحریرات میں والدہ ماجدہ کا ذکر اور کہیں نہیں ملا ۔

پھوپھی کا انتقال : ۱۸ ربیع‌الاول ۱۲۷۰ھ (۲۰ دسمبر ۱۸۵۳ء) کو میرزا کی ایک پھوپھی کا انتقال ہوا جس کی شادی دھلی میں غالباً نواب احمد بخش خاں کے خاندان کے کسی فرد سے ہوئی تھی مگر بظاهر وہ بیوہ ہو گئی تھی اور اس کی اولاد کوئی نہ تھی ۔ مندرجہ بالا خط میں غالباً اسی پھوپھی کے متعلق لکھتے ھیں ۔

"اس سے بڑھ کر یہ کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر - - - - -"

اس پھوپھی کو خاندانی پنشن میں سے بھی حصہ ملتا تھا اور غالباً اس کے شوہر کی جائداد سے بھی کچھ نہ کچھ آمدنی ہوگی ۔ اور وہ برابر اپنے جلیل‌القدر بھتیجے سے سلوک کرتی رہتی تھی ۔

اس پھوپھی کے انتقال پر میرزا نے منشی نبی بخش حقیر کو ایک خط لکھا ۔ (مرقومہ ۲۲ دسمبر ۱۸۵۳ء)

"منگل کے دن ۱۸ ربیع‌الاول کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی ، مرگئی ۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے ۔ تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا ۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ھیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ نو آدمی آج یک بار مر گئے ۔"

(نادرات غالب صفحہ ۴۹ - ۵۰)

ایک غور طلب سوال : اس سلسلے میں غور طلب سوال یہ ہے کہ میرزا نے تین پھوپھیوں ، تین چچاؤں ایک والد ایک دادا اور ایک دادیؔ کا ذکر کیا لیکن والدہ کا کوئی ذکر نہ کیا۔ کیا میرزا ذکر کرنا بھول گئے ؟ یہ بظاہر قرین قیاس نہیں کیونکہ تمام رشتہ داروں کو یاد کیا مگر والدہ کو یاد نہ کیا جو حقیقتاً والد سے بھی پہلے آنی چاہیے تھی ۔ اگر کہا جائے کہ صرف آبائی سلسلے کے رشتہ داروں کا ذکر پیش نظر تھا تو دادی کا ذکر کیوں کیا ؟ وہ بھی تو خالص آبائی سلسلے میں محسوبہ نہ تھی ۔ دادا کی بیگم والد ، چچاؤں اور پھوپھیوں کی والدہ ہی تھی یا کیا یہ سمجھا جائے کہ اس خط میں والدہ کا ذکر سہواً حذف ہو گیا ؟

سب سے آخر میں یہ کہ آیا اس وقت تک میرزا کی والدہ ماجدہ زندہ تھیں ؟ لہذا متوفی افراد خاندان میں ان کا ذکر نہ کیا ۔ ۱۸۵۳ء میں والدہ کی عمر زیادہ سے زیادہ پچھتر برس کی ہوگی اور اس عمر تک زندہ رہنا نادرات میں سے نہ تھا ۔ اگر اس مفروضے کو درست مانا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعد میں تو والدہ ماجدہ کی وفات کے ذکر کا زیادہ سے زیادہ امکان تھا ۔ تاہم کہیں ایسی کوئی بات نہیں ملی ۔ کیا اہل علم اس ضروری معاملے پر خاص توجہ مبذول فرمائیں گے ؟

★

انہیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیوں لڑئیے ؟
ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہیئے

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہیئے

غالب

غالب کی شاعری میں چند ایسی خصوصیات ھیں جن سے وہ مقبول بھی ہوئے اور عظیم شاعر بھی ثابت ہوئے ۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کے بنیادی جذبوں کی ترجمانی کرتے ھیں ۔ یہ وہ جذبے ھیں جو سب انسانوں میں مشترک ھیں ۔ اور جب کوئی شاعر ان کا موثر اظہار کرتا ھے تو ایک دو نہیں سبھی انسان اس سے متاثر ہوتے ھیں ۔ اور اسکے کلام کو پسند کرتے ھیں ۔

غالب کی شاعری میں غم بھی ھے ۔ مگر ان کے غم انگیز خیالات سے طبیعت مایوس نہیں ھوتی بلکہ غم کی بات بھی ایک خوشگوار تاثر چھوڑ جاتی ھے ۔ غم کو میٹھا بنا کر پیش کرنے سے دو طرح کے لطف پیدا ہوتے ھیں ۔ ایک لطف تو خود غم کا ھے دوسرا لطف اس طرز بیان کا ھوتا ہے جو غم میں راحت کا پیوند لگا دیتا ہے ۔

غالب کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ھے کہ وہ عمر کے ہر دور میں موثر ہے ۔ اس میں ایسے اشعار بھی ھیں جو جوانی کے لیئے ھیں ۔ ایسے بھی جو درمیانی عمر میں اچھے لگتے ھیں اور ایسے بھی جو عمر کے آخری دور کے لئے موزوں ھیں ۔ غرض ہر مزاج اور ہر دور عمر کی شاعری کلام غالب میں موجود ھے ۔

غالب نے اپنے ملک میں اور اپنے زمانے میں بھی نام پایا لیکن وفات کے بعد اور اپنے ملک سے باہر بھی مقبول ہوئے ۔ یہ انکی شاعری کی آفاقیت کی دلیل ہے ۔

غالب کا ایک تصور زندگی ایسا ہے جو دل پر خاصا اثر چھوڑتا ہے ۔ مشکل حالات میں ثابت قدم رہنا اور اپنی زندہ دلی کو ترک نہ کرنا ۔ یہ دستور حیات قابل تقلید ہے اور اس سے غالب کی ہمت عالی اور عزم توانا کا پتہ چلتا ہے ۔

غالب کا اسلوب بیان بھی ان کے معانی کی طرح دلکش اور دلپسند ہے ——— اس میں رعب ، قوت ، لطافت ، شیرینی اور لطافت کا اجتماع ہے ۔

غالب کی فارسی شاعری ، اپنے خاص میدان میں فارسی کے بڑے شعرا کے کلام کے مقابلے میں رکھی جا سکتی ہے ——، فارسی شاعری میں توانا جذبوں کے ساتھ علم و حکمت اور معرفت و بصیرت بھی ہے ۔

غالب نے فارسی اور اردو میں بڑی عمدہ نثر لکھی ——اور اردو کی نثر تو سٹائل کا ایک نادر شاہکار ہے ۔

اس پر غالب کی دلکش شخصیت بھی کچھ کم جاذب توجہ نہیں ——

ان سب عناصر نے مل کر غالب کو ایک عظیم شاعر اور ایک عظیم تر انسان بنا دیا ہے ۔

★

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

(غالب)

کچھ غالب کے بارے میں

شعر اصلاً ایک تہہ دار ادراک حقیقت ہے - جو تعقل کے پروں سے اڑے یا تخیل کے سہارے آگے بڑھے بہر حال اسکی جڑیں اصلاً ادراک ھی میں پیوست رھتی ھیں -

کسی چیز کا ادراک بیک وقت کاملاً ناممکن ہے - یہ اشیائے جسمی کی کیفیت ھے اسکی وجہ یہ ھے کہ زاویہ نظر بدلنے سے اس چیز کی صورت بدل جاتی ھے - یہ جو کہا گیا ھے کہ مضمون ایک ھی ھے لیکن دو شاعروں نے مختلف اسالیب میں بیان کیا ہے - اس سے بڑا جھوٹ انتقاد کے دائرے میں کم بولا گیا ھوگا -

اسلوب اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ معانی نہ بدل جائیں - فلابیئر اور اسکے تتبع میں کروچے یہ کہتے ھین کہ ایک حقیقت کے لئے ایک ذھنی گرفت کے لئے دنیا میں فقط ایک ھی لفظ یا کلمہ موجود ھوتا ہے وہ مل گیا تو شاعر کو اظہار و ابلاغ دونوں مل گئے اور نہ ملا تو درماندہ و محروم رھا -

اب اشیائے جسمانی سے قطع نظر تعقلات و واردات پہ نظر فرمائیے - زاویئے کے بدلنے سے ان کی شکل ان کی نوعیت ان کی کیفیت اور ان کے معانی کس طرح اپنے محور پہ گھوم کے بدل جاتے ھونگے - غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ حقائق کو یہ سمجھ کر کہ یہ جواھر آبدار سے مشابہ ھیں جن کی چھوٹ پہلو بہ پہلو پڑتی ھے ھر زاویہ نظر سے دیکھتا ھے اور یوں اسکے یک اسلوبی غزلوں کے بعض اشعار مل کر کائنات کے ایک گوشے کا پورا تصور بن جاتے ھیں - اس

کوشش میں انتخاب الفاظ کا معاملہ بڑا کٹھن ہے اور جو میدان حقائق سامنے سر کرنے کے لئے پڑا ہے وہ شاعر کو یوں نظر آتا ہے ۔

ع موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آبدار تھا

یہی وجہ ہے کہ غالب نے بات کو یوں بھی دیکھا ہے کہ

ع سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

اور یوں بھی پہچانا ہے

ع اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

باغ ، چمن اور متعلقہ کلمات غالب کے ہاں علامتیں ہیں ۔ یہ اسکے کلام کے مرموزات میں سے ہے ۔

ع میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

اس چمن سے اس چمن تک جہاں غالب کو دل نہیں ملتا کہ چراغاں کی بہار دکھائے سینکڑوں ضمنی علامتیں موجود ہیں ۔ یہی کیفیت کوھکن اور فرہاد کی ہے۔ میں نے اکثر سوچا ہے کہ غالب کوھکن کو ایک صناع اور فرہاد کو محض ایک عاشق تصور کرتا تھا ۔ ان اشعار پر غور کیجیئے کہ یہی خاتمہ کلام ہیں ۔

ع کوھکن نقاش یک، تمثال شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

ع عشق و مزدوریٔ عشرت گاہ خسرو کیا خوب
ہم کو منظور نکو نامیٔ فرہاد نہیں

ع تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد

سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

یہ تیشۂ غم ہے اس لیئے کوہکن سے یہی وجہ ہے کہ تصریح کی ہے کہ

ع دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں

مطالعہ غالب کے بنیادی مسائل

گذشتہ سو سال میں غالب پر خاصا کام ہو چکا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک ان پر کوئی ایسی جامع اور مستند کتاب نہیں لکھی گئی ہے جس کی بنیاد تحقیق اور تنقید کے جدید اصولوں پر استوار ہو ۔

حیات غالب کے جن معاملات و مسائل پر تحقیق کی ضرورت ہے ان میں سب سے پہلے تو ان کے حسب نسب اور خاندان کا مسئلہ ہے ۔ اب تک اس موضوع پر جن لوگوں نے لکھا ہے انہوں نے اس سلسلے میں غالب کی کہی ہوئی باتوں کو تسلیم کر لیا ہے ۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ غالب ایک طرح کے احساس برتری میں مبتلا تھے ۔ یہ احساس برتری اس انحطاط و زوال کی پیداوار تھا جس میں سے ہو کر ان کی زندگی کا قافلہ گذرا تھا ۔ وہ سیاسی اعتبار سے ایک زوال آمادہ معاشرے کی پیداوار تھے ۔ ایک ایسے معاشرے میں افراد کا اس احساس برتری کا شکار ہونا ضروری ہے ۔ خاص طور پر ایسے افراد کا جن کی نسلی وجاہت اور خاندانی شرافت ناسازگار معاشی حالات کے باعث آندھیوں کی زد پر ہو ۔ اسی صورت حال نے غالب کو نرگسیت کا شکار کر دیا ۔ اس لئے انہوں نے جو کچھ اپنی نسل اور خاندان کے بارے میں کہا ہے اس کو تسلیم کر لینا علمی اور تحقیقی اعتبار سے کسی طرح مناسب نہیں ہے ۔ وسط ایشیا میں ترکوں کی تاریخ اور انکے مختلف خاندانوں کے ماخذ کو سامنے رکھا جائے ، اور اس نسل کے جو لوگ ہندوستان آئے ان کی تفصیل کا سراغ لگایا جائے تو اس سلسلے میں بعض بڑی ہی دلچسپ اور قابل قدر معلومات کا سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے اور غالب کی نسل اور خاندان کے بارے میں بعض اہم پہلو سامنے آ سکتے ہیں ۔

غالب کے دادا قوقان بیگ خان ہندوستان آئے لیکن اس معاملے میں اختلاف ہے کہ وہ شاہ عالم کے عہد میں اس سر زمین پر پہنچے یا محمد شاہ کے زمانے میں ۔ پھر ان کی زندگی کے حالات کی تفصیل بھی کہیں نہیں ملتی ۔ صرف اتنی معلومات فراہم ہوتی ہیں کہ وہ پہلے پنجاب میں ٹھہرے ۔ یہاں معقول ملازمت ملی ۔ پھر دلی چلے گئے ۔ لیکن دلی میں ان کے دن کیسے گذرے ۔ انہوں نے شادی کہاں کی ؟ ان کی ازدواجی زندگی کیسی تھی ؟ ان باتوں کے متعلق پوری طرح علم نہیں ہوتا ۔ اسی طرح غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں کے بارے میں بھی تفصیل کہیں نہیں ملتی ۔ ان کی ملازمتوں کے بارے میں تو تھوڑا بہت علم ہو جاتا ہے لیکن ان کی خاندانی اور نجی زندگی کے بارے میں ابھی بہت کچھ پردہ خفا میں ہے ۔ غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کے حالات بھی صرف چند سطروں میں ملتے ہیں ۔ ان کے بارے میں بھی تفصیلات کا علم نہیں ہوتا ۔ یہی حال غالب کے نانا غلام حسین خاں کمیدان اور دوسرے عزیزوں کا ہے ۔ ان کے متعلق بھی ہماری معلومات بہت محدود ہیں ۔ غالب کی زندگی میں ان بزرگوں کی جو اہمیت ہے وہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائیں ۔ کیونکہ غالب کی زندگی اور شخصیت پر ان سب کے اثرات بہت گہرے ہیں ۔

غالب کے بچپن کا جو زمانہ اکبر آباد میں گذرا ہے وہ ان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ لیکن اس زمانے کے بارے میں جو معلومات اب تک لکھنے والوں نے فراہم کی ہیں وہ ناکافی ہیں ۔ اس زمانے میں وہ پتنگ اڑاتے ، چوسر اور شطرنج کھیلتے اور نوجوان دوستوں کے ساتھ اچھا وقت گذارتے تھے ۔ یہ لوگ کون تھے ؟ غالب پر اس زمانے میں کن لوگوں کے اثرات گہرے ہوئے ؟ ان کی تعلیم کہاں کہاں اور کس طرح ہوئی ؟ وہ واقعی نظیر اکبرآبادی کے مکتب میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے ؟ مولوی معظم جن کے سامنے انہوں نے زانوئے ادب تہہ کیا وہ کون بزرگ تھے اور ان کی علمی استعداد کیا تھی ؟ ہرمزد یا عبدالصمد کون تھا ؟ کہاں سے آیا ؟ کہاں گیا ؟ اس کی

زندگی کس طرح گذری ؟ اور آیا اس نام کا کوئی شخص تھا بھی یا نہیں ؟ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں ہم ابھی زیادہ نہیں جانتے ۔ جو حالات ہم تک پہنچے ہیں ، ظاہر ہے کہ ہمیں ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ تفصیل کی ضرورت ہے ۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جس زمانے میں غالب نے آکبر آباد کی سرزمین پر ہوش سنبھالا اور ان کا ذہنی نشو و نما ہوا ، اس وقت وہاں کا علمی اور ادبی ماحول کیا تھا ۔ نظیر اکبر آبادی تو خیر وہاں موجود تھے لیکن ان کے علاوہ اور کون کون سے شاعر تھے جن سے غالب نے اثر قبول کیا ؟ وہ کس کے شاگرد ہوئے ؟ اور اگر شاگرد نہیں ہوئے تو کیوں نہیں ہوئے ؟ ان تمام پہلوؤں پر بھی اچھا تحقیقی کام ہونا چاہیئے ۔

غالب کی زندگی کے حالات سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مالی پریشانیوں میں گذرا ہے اور وہ ہمیشہ غم دوراں کا شکار رہے ہیں ۔ ان حالات کے سائے میں انہوں نے کس طرح زندگی گذاری ہے ، اور اس کے کیا اثرات ان پر ہوئے ہیں ؟ قرض انہوں نے کس کس طرح کن لوگوں سے لیا ہے اور اس قرض کی ادائیگی کس طرح کی ہے ؟ یہ بھی تحقیق کا ایک اہم موضوع ہے ۔ ابھی تک اس موضوع پر بھی کوئی خاص کام نہیں ہوا ہے ۔

اس کے علاوہ پنشن کا معاملہ بہ ذات خود بھی تحقیق کا ایک اہم مسئلہ ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے کلکتہ کا جو سفر کیا ہے ، اس کے بارے میں بھی ابھی تک مکمل معلومات فراہم نہیں ہو سکی ہیں ۔ یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلی سے کان پور اور بنارس ہوتے ہوئے لکھنؤ گئے تھے ۔ وہاں ان کی آؤ بھگت ہوئی تھی ۔ آغا میر سے انکی ملاقات نہیں ہو سکی تھی ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کا طوطی بولتا تھا ۔ ناممکن ہے کہ ناسخ سے لکھنؤ میں ان کی ملاقات نہ ہوئی ہو ۔ لیکن غالب کے متعلق کسی لکھنے والے نے اس

موضوع پر کوئی ایسی بات نہیں کہی جس کی بنیاد تحقیق پر استوار ہو ۔ پھر بنارس میں غالب کا وقت کس طرح گذرا ؟ کلکتہ میں انہوں نے کس طرح دن گذارے ؟ ان کی مخالفت کیوں ہوئی اور اس کے نتائج کیا نکلے ؟ یہ تمام باتیں بھی مزید تحقیق کا تقاضا کرتی ہیں ۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی دلی کی زندگی کے بارے میں لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ھے لیکن اس زمانے کی سیاسی اور مذہبی ہنگامہ آرائیوں میں ان کا کیا حصہ تھا ؟ مولانا سید احمد بریلوی کی تحریک کی مخالفت اور مولانا فضل حق خیر آبادی کی حمایت میں انہوں نے کیا کیا کچھ کیا ؟ ذوق ، مومن ، شیفتہ اور بہادر شاہ سے ان کے جو روابط تھے اس کے بارے میں بھی ابھی تک بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے ۔

پھر ان کے قید ہونے کا واقعہ ، ان کا مقدمہ ، قلعے میں ان کی باریابی ، غدر کے بعد ان کی زندگی اور اس کے معاملات و مسائل یہ تمام پہلو غالب کی زندگی میں خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں لیکن ان کے بارے میں بھی اب تک جو معلومات فراہم کی گئی ہیں اس کو دیکھ کر بھی تشنگی کا احساس ہوتا ھے ۔

غرض غالب کی زندگی کے بیشمار پہلو ابھی ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک تحقیق کا ایک اہم موضوع بن سکتا ہے ۔ جب تک ان موضوعات پر تحقیق کے بعد تفصیلی معلومات فراہم نہیں ہوتیں ۔ غالب کی زندگی کا مطالعہ نامکمل رہیگا ۔ اور ان کی صحیح تصویر ہمارے سامنے نہیں آ سکتی ۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب پر اب تک جو کام ہوا ھے وہ اپنی اپنی جگہ اہم ہے ۔ اور غالب اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ھے لیکن اس میں تحقیقی وزن بہت کم ھے اور اس کا بیشتر حصہ غیر مربوط، تشنہ اور نا مکمل ہے ۔

شاید یہی وجہ ہے کہ غالب پر ابھی تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی،

جس کو ان کی مکمل اور مستند سوانح حیات کہا جائے ۔ بات یہ ہے کہ مکمل اور مستند سوانح حیات، حالات و واقعات کی تحقیق کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی ۔ لیکن ظاہر ہے کہ صرف حالات اور واقعات کا جمع کر دینا ہی سوانح حیات نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے ۔

غالب کا مطالعہ آج ایک ایسی ہی سوانح حیات کے لئے چشم براہ ہے جس میں ان کی زندگی کے حالات و واقعات کی تحقیق اور تفصیل کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو!

★

غالب اپنے معاصرین کی نظر میں

غالب کو اس دنیا سے رخصت ہوئے پوری ایک صدی گزر چکی ۔ سو برس گزر چکنے کے بعد بھی غالب کی جن بے شمار باتوں کی یاد وقت کے صفحہ دل پر نقش ہے ان میں میرے نزدیک سب سے اہم یہ ہے کہ غالب نے ہمیں غم کی صحیح حقیقت سے آشنا کیا اور غموں پر ہنسنے اور غموں میں گھرے رہ کر بھی زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سکھایا ۔ غالب کی کتاب زندگی کا ہر ورق ایک روشن دستاویز کی طرح ہمارے سامنے کھلا ہوا ہے اور ہم میں سے ہر ایک اردو شاعری کے اس بطل عظیم کے چھوٹے بڑے ہر راز سے واقف ہے ۔ واقف اس لئے کہ غالب نے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھی کہ وہ آپ اپنی نظر میں کیا ہے ۔ یہی حال اس کے بے شمار معاصرین کا ہے جنھوں نے اس کے جیتے جی اس کے متعلق اتنی باتیں کہی ہیں کہ ہم غالب شناسی کی مہم میں ہمیشہ اپنے سفر کا آغاز انہیں باتوں سے کرتے اور انہیں کی مدد سے تاثرات کی شیرازہ بندی کرتے ہیں ۔ غالب کی داستان حیات کے مختلف رخوں کی ترتیب کرتے وقت ہمیں یہ ضرب المثل شعر پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

غالب کے معاصرین کے تذکرے اٹھا لیجئے ۔ سب ہم خیال اور ہم زبان ہو کر اس کی نغز گوئی اور نکتہ سنجی کے معترف بھی ہیں اور قصیدہ خوان بھی ۔ شیفتہ اپنے تذکرے میں ان کی اس دوگونہ صلاحیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔ " اگر طبع سخن شناس داری بہاین نکتہ می رسی چہ خوش فکر اگر چہ کم یاب است ام خوش فہم کم یاب تر ۔ خوشا حال شخصے کہ از ہر دو شرپے یافتہ و حظے ربودہ " ۔

ایک اور معاصرہ تذکرہ نگار منشی کریم الدین نے گلدستہ نازنیناں میں ان کی نثر و نظم کی تعریف میں یہ مبالغہ کیا ہے کہ سحبان ابن دائل ، متبنی ، نظیری ، انوری خاقانی اور ظہوری کو اس کے خوان یغما کا خوشہ چین اور اس کے آستانۂ ادب کا جاروب کش کہا ھے ۔ کریم الدین نے اپنے دوسرے تذکرے طبقات الشعرا میں بات بغیر مبالغے کے یوں کہی ہے کہ " جیسا کہ وہ شخص فارسی میں استاد کامل ہے ایسا ہی اردو میں بھی جلیل‌القدر استاد ھے "۔ ایک اور معاصر تذکرہ نگار قطب الدین باطن نے گلستان بے خزاں میں چشمک کا انداز اختیار کرتے ہوئے یوں دل کے پھپھولے پھوڑے ھیں" ان کو شراب و کباب چاہئے ۔ خلاف شرع کا بے حساب چاہئے ۔ روزے کے نام سے انھیں کیا کام ۔ نماز کو ان کا ہر دم سلام ۔ اصحاب تذکرہ کی تحریر دیکھی اور ان کی تقریر دیکھی ۔ کیا غرور ھیں ۔ اپنے نزدیک کتنے دور ھیں ۔ یاران محبت ان سے زیادہ غرور میں چور ھیں ، گویا ان کے یار خوشامد کے مزدور ھیں "۔ باطن کو یہاں پہنچ کر ہوش آتا ھے اور ایک زبان سے غالب کی یہ تضحیک کرکے انصاف کے ہاتھوں مجبور ہوتے اور فوراً دوسری زبان سے اس کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف شروع کرتے ھیں ۔ اس جگہ ان کے الفاظ میں صاف پچھتاوے کا رنگ ہے ۔ " ھیں ! ھیں ! باطن کدھر گیا ۔ جوش میں بھر گیا ۔ خبردار ! ہوشیار ! ان کے اسد فکر کا نخچیر مضمون پر غلبہ ھے ۔ خمسہ ان کا شیر کا پنجہ ھے "

غالب کے سب معاصر تذکرہ نگاروں کا ان کی تعریف و توصیف میں یہی حال ہے ۔ سب اپنے اپنے انداز میں انھیں اردو اور فارسی کا قادرالکلام شاعر مانتے ھیں اور ان کی سخن گوئی کے ساتھ ان کی سخن فہمی ، اور معنی آفرینی کے ساتھ ان کی معنی پروری کے اوصاف بیان کرنے میں رطب‌اللسان ھیں ۔ ہر لکھنے والے کے انداز میں عظمت کے اعتراف کے ساتھ اس کی عقیدت مندی کا عکس بھی ھے ۔ اس کی سب سے نمایاں مثال آثار الصنادید میں سرسید احمد خان کی عقیدت مندانہ اور منصفانہ ستائش ھے ۔ کہتے ھیں :-

" بہترین شغل آپ کا اس عالم تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ھے ۔

حق یہ ہے کہ جان سخن پر منت اور سر معنی پر بار احسان رکھتے ہیں ۔ ہر دائرہ الفاظ دہن شکر اور ہر حرف زبان سپاس ہے ان کی نعمت تربیت کا ۔ میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں اور دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے ۔ خوشا حال ان لوگوں کا جو آپ کی خدمت بابرکت سے مستفید ہوتے ہیں - - - - - - - - - مثل مبداء فیاض کے آپ کی طبیعت موہبت نسبت بخل سے مبرا ہے آپ کو ان جواہر بے بہا کے اعطاء میں کچھ دریغ نہیں " ۔

تذکرہ نگاروں کے بیان سے قطع نظر کرکے اگر ہم غالب کے معاصرین کی لکھی ہوئی ان کتابوں پر نظر ڈالیں جن میں بعض ملاقاتوں کا ذکر ہے تو ہمارے سامنے اس غالب کی تصویر آتی ہے جو دنیائے شاعری میں تو آپ اپنی مثال تھا ، اپنے ذاتی اوصاف کے لحاظ سے بھی اپنے عہد کی تہذیب و شائستگی اور مروت و وفاداری کا پیکر اور عجز و انکسار اور کسر نفسی و فروتنی کا مجسمہ تھا ۔ اس وقت دو کتابوں کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں ۔ سید غوث علی شاہ قلندر عہد غالب کے ایک بزرگ باصفا تھے ۔ ان کا حلقہ ارادت بڑا وسیع تھا ۔ ان بزرگ کے بہت سے ملفوظات جو ان کے واردات ، تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہیں ایک مرید نے "تذکرہء غوثیہ" میں محفوظ کر دئے ہیں ۔ ان میں غالب سے ان کی ملاقاتوں اور ان ملاقاتوں کے تاثرات کی تفصیل بڑے پر لطف انداز میں انھیں بزرگ کی زبانی بیان ہوئی ہے ۔ مختصر سی باتیں انھیں کی زبان میں سن لیجئے :-

ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے ۔ نہایت حسن اخلاق سے ملے ۔ لب فرش تک آ کر لے گئے اور ہمارا حال دریافت کیا ۔ ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت پسند ہے ، علی الخصوص یہ شعر :-

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو
تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب ! یہ شعر تو میرا نہیں ، کسی استاد کا ہے ۔ فی‌الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے؛ ۔

اس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت‌المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے ۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجیے مگر وہ کب مانتے تھے ۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں ، مے خوار ، روسیاہ ، گنہ گار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے ۔ البتہ الوش کا مضائقہ نہیں ۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا،، بات یہاں ختم ہو جاتی ہے اور میں غالب کا یہ شعر یاد کرتا ہوں ۔

اگر کلیم شود ہم زبان سخن نکینم   وگر خلیل شود میہمان بگردانیم

---

۱ تذکرے میں اس جگہ غالب کی اسی زمین کی پوری غزل نقل کردی گئی ہے، جس سے خیال ہوتا ہے کہ اس موقعے پر غالب نے غوث علی شاہ کو اپنی یہ غزل سنائی ہوگی :-

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی   میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے   کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی   اے وہ مجلس نہیں خلوت‌ہی‌سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے   غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو   آ گہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام   دل کے خون کرنے کی فرصت‌ہی‌سہی

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں   نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک ناانصاف   آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے   بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسد   گر نہیں وصل توحسرت ہی سہی

اور سوچتا ہوں کہ اللہ اللہ ''انا'' کی طلسم کاریاں، وہ بلند بینی و رفعت پسندی ایک طرف اور دوسری طرف یہ کسر نفسی اور فروتنی ۔

اس کے بعد تذکرہ غوثیہ میں مرزا نوشہ اور مرزا رجب علی بیگ کی اس ملاقات کا حال ہے جس کا ذکر غالب کے حالات میں جا بجا ملتا ہے ۔ اس ملاقات میں بات یہ ہوئی کہ سرور غالب سے ملنے گئے تو ان سے پوچھا کہ مرزا صاحب ''اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے ؟ جواب ملا ''چہار درویش کی'' اس پر سرور نے سوال کیا اور فسانہ عجائب کیسی ہے ؟'' ۔ غالب نے بے ساختہ جواب دیا ''اجی ! لاحول ولا قوۃ اس میں لطف زبان کہاں ! ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے'' ۔ یہ بات کہتے وقت غالب کو معلوم نہیں تھا کہ وہ یہ رائے خود فسانۂ عجائب کے مصنف سے کہہ رہے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد جب پتہ چلا تو سخت ندامت محسوس کی اور پھر غلطی کی تلافی کے لیے مرزا رجب علی بیگ سے ملنے گئے اور باتوں باتوں میں فسانۂ عجائب کا ذکر چھیڑ کر معذرت کی اور کہا کہ رات ہم نے فسانۂ عجائب کو غور سے پڑھا ۔ اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے ۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہو گی ۔'' غالب نے اپنی باتوں سے سرور کو خوش کیا اور دوسرے دن ان کی دعوت کی ۔

اس واقعے کا ذکر کرکے غوث علی شاہ مرزا کے متعلق کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے ۔

غالب کا انتقال ہوا تو شاہ صاحب زندہ تھے ۔ کسی نے انتقال کی خبر سنائی تو شاہ صاحب نے فرمایا ''انا للہ و انا الیہ راجعون نہایت خوب آدمی تھے ۔ عجز و انکسار بہت تھا ۔ فقیر دوست بدرجہ غایت اور خلیق از حد تھے ۔ ایک روز ہم ان کے پاس گئے تو انہوں نے اپنے یہ دو قطعے پڑھے تھے :

فرصت اگرت دست دھد مغتنم انگار   ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند   حق‌را بہ سجودے و نبی‌را بہ درودے

بروزِ حشر الٰہی چو نامۂ عملم کنند بازکہ آن‌روز باز خواہ من است
بکن مقابلہ آن راز سرنوشت ازل اگر زیادہ وکم باشد آن گناہ من است

رند مشرب ، بے شر ، رحم دل تھےاور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے لیکن افسوس یہ ہمارے محب بھی چل دیئے ۔

سید فرزند احمد صغیر بلگرامی غالب کے ایک فاضل اور نامور شاگرد ہیں ۔ وہ غالب سے ملنےدھلی آئے اور دو ڈھائی مہینے تک یہاں رہے۔ غالب سے اپنی ملاقاتوں کا حال اور غالب کے متعلق اپنے تاثرات انھوں نے اپنی تصنیف جلوۂ خضر میں بڑی تفصیل سے لکھے ہیں ۔ کچھ ٹکڑے ملاحظہ فرمائیے :

(۱) دس بجے شب کو دھلی پہنچا ، شب جمنا پار لال قلعے کے نیچے بسر کی۔ صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلہ بلی ماران میں حضرت غالب کے پاس پہنچا ، حضرت برآمدے میں بیٹھے کلی پی رہے تھے ، ماموں صاحب بھی حاضر ہوئے ، دیکھ کر بشاش ہو گئے ، اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا پوچھا یہ کون ہیں ۔ عرض کیا صغیر ، ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا ، بولے ذرا ٹھہر جائیے ، یہ کہہ کر بدقت ھاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اٹھے ، اور بغل گیر ہوئے ، اور برآمدے سے اندر آ کر بیٹھے ، گرمی کے دن تھے ، صفر کا مہینہ تھا ، حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا پاجامہ سیاہ بوٹے دار دریس کا کلی دار ، نیفہ سرخ ٹول کا، بدن میں مرزائی ، سر کھلا ہوا ، رنگ سرخ سفید ، منہ پر داڑھی دو انگل کی ، آنکھیں بڑی ، کان بڑے ، قد لمبا ، ولائیتی صورت ، پاؤں کی انگلیاں بہ سبب کثرت شرب کے موٹی ہو کر اینٹھ گئی تھیں ، اور یہی سبب تھا کہ اٹھنے میں دقت ہوتی تھی ، آنکھوں میں نور موجود تھا ، کان کی سماعت میں کچھ ثقل آ چلا تھا ۔

الغرض اندر آ کر بیٹھے ، بعد مزاج پرسی کے نانا صاحب کو بہت پوچھا اور کہا افسوس کوئی سبب ایسا نہیں ہوتا جو حضرت کی ملازمت کروں ، اتنے میں نواب ضیاءالدین خاں بھی تشریف لائے ، حضرت نے مجھے ان سے ملایا ۔ وہ بھی وجیہہ آدمی رئیسوں کی وضع پر تھے ، کرتا پہنے ، خلطہ دار پاجامہ ، سر پر ٹوپی ،

جریب هاتھ میں ، بعد اس کے حضرت نے ان سے میرا حال کہا اور فرمایا یہ میری ملاقات کو آرے سے آئے ہیں ، اس کے بعد کچھ ان سے سرگوشی ہوئی جب وہ اٹھ گئے اور دوپہر قریب ہوئی تو حضرت اٹھے اور مجھے اور میرے ماموں کو اپنا تمام مکان دکھایا ہر جگہ کا نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ فلاں کام کے واسطے ، آخر زینے کے پاس آئے، ہم لوگ بھی ساتھ تھے، اوپر جا کر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک کمرا گلی کے رخ بنا ہوا تھا ۔

لطیفہ ۔ فرمایا میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے یہ کہہ کر ہنسے اور بولے آپ سمجھے ، میں نے کہا سمجھا ، یعنی گرمی کے دن میں دھلی کی گرمی اور تمازت آفتاب سے در و دیوار اس قدر جلتے ہیں کہ آدھی رات تک ان کی گرمی فرو ہوتی ہے ، الغرض ، پھر کوٹھے کے نیچے آئے اور فرمایا اس مکان کے دکھانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان میں گنجائش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں ، اس لیے ضیاءالدین خان صاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب ہے ، آپ کے واسطے تجویز ہوا ھے ، گو تھوڑا سا دور ھے مگر آرام بہت ملے گا ، میں نے عرض کی مجھے حضوری ضروری ھے ، فرمایا کچھ ایسا دور نہیں ہے ، یہ کہہ کر اپنے ایک رفیق کو بلایا اور میرے ساتھ کیا ۔

(احوال غالب صفحہ ۵۹ ، ۶۰)

(۲) ہر روز کی ملازمت سے طبیعت محظوظ ہوتی رہی ، ایک دن قریب دوپہر کے پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں قریب پٹی کے حاضر تھا ، بولے کیوں حضرت برف کا پانی پیو گے میں نے کہا اگر کوثر کا پانی پینا ہو تو پلوائیے ، ہنس کر بولے ضرور ، اور آدمی کو پکار کر کہا کہ فلاں کوئیں سے پانی لے آؤ ، میں نے کہا حضور نے برف کا پانی کہا تھا ، فرمایا برف ھی کا ھے غرض پانی آیا ، پیا واقعی سرد تھا ، فرمایا یہ ایک کنواں ھے جس کا پانی ایسا ہوتا ھے ۔

(احوال غالب صفحہ ۶۱)

(۳) مجھ سے اور حضرت غالب علیہ الرحمتہ سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دھلی کی

زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی ۔ فرمایا ، میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے ، ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا ، اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے ، ہاں قواعد لکھ نہیں گیا ، قواعد جاننے والا اس کے کلام میں مزا پاتا ہے ، ہماری دلی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رہا مگر یاد رہے ، اس مضمون میں دلی کے برابر میں کسی کو نہیں سمجھتا ، پھر ہنس کر فرمانے لگے، اس زبان پر اس کے سوا اور ہوتا کیا ، میں نے بھی ایک طرز خاص ایجاد کیا تھا ، جس مین ہر طرح کے مضمون کو نشو و نما ہو سکتا تھا ، مگر یاروں نے چلنے نہ دیا ، اور سچ پوچھو تو یہ ایجاد ناسخ کا ہے ، میاں ، جب ناسخ کا کلام دھلی میں پہنچا ، جیسا تم نے دلی کے دیوان کا حال سنا ہوگا کہ دلی میں آیا تو جیسے نئی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں ، اسی طرح اس کے کلام پر گر پڑے ، اس وقت فارسی کی شاعری دھلی میں بہت چمکی تھی ، مگر اردو کی مداخلت فقط بول چال میں تھی ۔ اس کو مسلسل نظم میں جو دیکھا تو نو خیز اور فارسی دان سب اس کی تقلید پر چلنے لگے ، اور ہر ایک نے اپنے اپنے معلومات کے مطابق رہ سپری کی ۔ مگر وہ فقط زبان کو نظم کر دینا تھا ۔ کچھ ایسی دقت نہ ہوئی پھر بھی جتنے لوگوں نے ادھر توجہ کی ، ہر ایک کی نئی طرز ہو گئی ، مگر ناسخ کے کلام نے دھلی میں آ کر سب کو حیران کر دیا ، اور قاعدے کے ساتھ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا دلوں کو بر انگیختہ کرنے لگا ، یہاں تک کہ شعرا نے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا ، اس وقت ہم تین شاعر با مذاق نام بر آوردہ تھے ، میں اور مومن خان اور ذوق ، ذوق نے ادھر کم رغبت کی ، کیوں کہ ان کو اپنے مضمون ہی کے باندھنے میں دقت پڑتی تھی ، زبان کی طرف کب خیال کر سکتے ہیں، مگر مومن خان نے خیال کیا ، پہلے یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے، شاہ نصیر کی جو طرز ہے وہ معلوم ہے ، مگر مومن خان نے ان کو چھوڑ کر ناسخ کی طرز پر غور کیا اور فارسی کی تراش خراش پر توجہ کی ، ادھر میں نے بھی ، غرض ہم دونوں دھلی کے طرز بیان

کو چھوڑ کر ترکیب اور بندش کی درستی میں مصروف ہوئے ، مگر جب بہت کچھ کہہ گئے تو دیکھا کہ ہم دونوں کی طرز الگ الگ ہو گئی ، اور کوئی ناسخ سے نہ ملی ۔ میں نے تو میرتقی میر کا انداز اختیار کیا اور مومن خان اپنے اسی رنگ میں رہے ، خلاصہ یہ کہ دھلی کی زبان میں ہر شاعر کے کلام میں اختلاف پاؤ گے اور اختلاف کی وجہ یہی ہے کہ ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا جس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی ایک ھی زبان ہو گئی ، وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہنچتے، ناچار اپنی جودت طبع سے جوکچھ ہوا وہ کیا مگر یاد رہے کہ مضمون دھلی کا اور زبان لکھنؤ کی مستند ہے ۔

(احوال غالب صفحہ ۶۳ ، ۶۴ ، ۶۵)

معاصرین کی کہی ہوئی ان جستہ جستہ باتوں سے غالب کی شخصیت اور مزاج کی جو تصویر سامنے آتی ہے اس کے نقش بڑے دلکش ھیں ۔ وہ فارسی اور اردو کے قادرالکلام شاعر ھیں ۔ ان کی سخن سنجی ، اور معنی آفرینی نے ہر کہ و مہ کو ان کا گرویدہ بنایا ہے ۔ ایک زمانہ ان کی صحبت و برکت سے کسب فیض کرتا اور اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو جلا دیتا ہے ۔ غالب کو اپنی عظمت کا واضح احساس ھے اور اس احساس نے انہیں دنیا کے سامنے سر اونچا رکھنے کی تعلیم دی ھے، لیکن ان کا احساس ذات عجز و انکسار اور کسر نفسی اور فروتنی کا تابع ہے اور ان کی شخصیت تہذیب و شائستگی اور مروت و وفاداری کا مرقع ہے ۔ ان کے کسی غیر شعوری عمل سے اگر کسی کی دل آزاری ہو جائے تو وہ اس کی تلافی کو انسانی فریضہ سمجھتے اور کسی نہ کسی طرح دکھے ہوئے دل پر مرہم رکھ کر اس کے لیے سکون کا سرمایہ بہم پہنچاتے ھیں ۔ زندگی کی تلخیوں پر ھنستا اور غم کی حالت میں بھی آزردگی و افسردگی کو پاس نہ آنے دینا ان کی فطرت ثانیہ ہے اور فطرت کی یہی ودیعت ھے جس میں سے زندگی بسر کرنے کا ایک ایسا سلیقہ ابھرتا ہے جس کی بدولت انسان ہر حال میں صابر ، شاکر اور مطمئن و مسرور رہتا ہے ۔

۲۹ مارچ ۱۹۶۸ء کو گورنمنٹ کالج وحدت کالونی ، لاهور میں یوم غالب منایا گیا تھا ۔ اس موقع پر عابدی صاحب نے غالب کے اس مقطع پر جو یہاں اُن کے مقالے کا موضوع ہے تقریر کی تھی ۔ چونکہ اس بنا پر یہ مقالہ 'دبستان' کا حق تھا، اس لیے اس تحقیقی نگارش کو موصوف سے حاصل کرکے ہم یہاں پیش کر رہے ہیں ۔
غالب کے زیر بحث مقطعے کا صحیح مفہوم اس پس منظر کے بغیر متعین نہیں ہوتا جو اس مقالے میں سامنے لایا گیا ہے ۔ (ادارہ)

ریختہ رشکِ فارسی

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

اس مقطع کا مفہوم متعین کرنے کے لئے کئی سوال پیدا ہوتے ہیں :

(۱) غالب نے اس مقطع میں جو بات کہی ہے کیا وہ ان کی طرف سے خود ان کے مشہور قول

فارسی خوان تا ببینی نقش های رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

کی تردید ہے ؟

جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن نہیں، اس لئے کہ یہ فارسی شعر ان کے جس قطعے کا ہے وہ انھوں نے ۲۱ ستمبر ۱۸۳۷ء کے بہت بعد کہا تھا، یعنی بہادر شاہ کی تخت نشینی کے بعد، چنانچہ ان کے دیوان فارسی کے قدیم ترین نسخے[۱] میں جس کے اصل متن کی کتابت بہادر شاہ کی تخت نشینی سے پہلے ہو چکی تھی اور پھر کچھ اضافوں کے ساتھ ۲۱ جنوری ۱۸۳۸ء کو اس کی دوبارہ شیرازہ‌بندی کی گئی، یہ قطعہ نہ متن میں موجود ہے نہ حاشیوں میں، بلکہ دیوان کے اس قلمی نسخے[۲] میں بھی جس کی کتابت جولائی ۱۸۳۸ء میں ختم ہوئی، یہ قطعہ متن میں درج نہیں۔ حاشیے میں بڑھایا گیا ہے۔ اس کے مقابل اردو غزل جس کا مقطع یہاں زیر بحث ہے ۱۸۲۱ء سے پہلے کی ہے، اس لئے کہ نسخۂ حمیدیہ میں موجود ہے، البتہ مقطع کا دوسرا مصرع جو غالب نے بعد میں بدلا ہے پہلے یوں تھا: شعر امد کے ایک دو پڑھ کے اسے سنا کہ یوں۔ ۱۸۲۱ء کے بعد غالب نے اس غزل کے نسخۂ حمیدیہ والے متن میں پانچ اشعار کا اضافہ بھی کیا جن کے قافیے ہیں: دیکھنا، ہوا، نقش پا، دست و پا۔ چنانچہ متداول دیوان میں ان اشعار کے اضافے کے بعد کی پوری غزل ہے۔ بہر حال زیر بحث مصرعہ: 'جو یہ کہے کہ ریختہ ہو رشک فارسی، کیونکہ غزل کے متن اول اور متن ثانی دونوں میں مشترک ہے۔

(۲) اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ آیا فارسی مقطع اردو مقطع کی تردید ہے تو پہلے یہ طے کرنا ہو گا کہ 'رشک فارسی' میں فارسی سے کیا مراد ہے۔ خود غالب کا اپنا فارسی کلام یا فارسی شعراء کا کلام؟

اس مصرعے: 'جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی' کا انداز بیان صاف بتا رہا ہے کہ اشارہ غیر کی طرف ہے۔ غالب اپنے فارسی کلام کی طرف اشارہ

---

۱ - یہ نسخہ راقم کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔

۲ - محفوظہ خدا بخش لائبریری بانکی پور، بھارت۔

کر رہے ہوتے تو بات اس طرح نہ کہتے ۔ مقطع میں سامع کو قائل کرنے کی کوشش اسی لئے ہے کہ یہاں اشارہ دوسروں کے کلام کی طرف ہے ۔ ایسی صورت میں سابقہ قول کی تردید کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ آخر میں غزل کا جو پس منظر ہم پیش کریں گے اس سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جائے گی ۔ لہذا یہ نہیں کہہ سکتے کہ غالب اپنی شاعری کے پہلے دور میں یعنی ۱۸۲۱ء سے پہلے اپنے اردو کلام کو اپنے فارسی کلام پر ترجیح دیتے تھے ۔

(۳) اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اگر 'رشک فارسی' میں فارسی سے مراد فارسی شعراء کا کلام ہے تو کیا غالب اپنی اس خاص غزل کو فارسی شاعری کے مقابل اردو شاعری کی برتری کا نمونہ سمجھتے تھے ؟

یہ بات ہرگز قرین قیاس نہیں ، اس لئے کہ اگر یہی مقصود ہوتا تو اس غزل کے بجائے مسلم طور پر غالب کی دوسری اردو غزلیں اس کی زیادہ مستحق تھیں اور یہ بات کسی توضیح اور تفصیل کی محتاج نہیں ۔ انیسویں صدی عیسوی کے سخن شناسوں میں شیفتہ نے اس غزل کا صرف ایک شعر اپنے تذکرے میں لیا ہے اور دوسری غزلوں کے کئی کئی شعر چنے ہیں ۔ شیفتہ کا پسندیدہ شعر یہ ہے :

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سنکے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

حالی نے بھی مقدمے میں صرف اسی ایک شعر کے دھرا دینے پر اکتفا کی ہے ۔ انتخاب کے لئے کوئی دوسرا شعر انہیں نہیں ملا ۔ یہ شعر بھی ظاہر ہے اس معاملہ بندی کی وجہ سے ان بزرگوں کو پسند آ گیا جو آداب معاشرت سے پیدا ہوتی ہے ، ورنہ غالب کی حکیمانہ عظمت فکر کا کوئی نقش اس شعر میں نہیں ابھرتا ، نہ یہ شعر ان کے حکیمانہ اسلوب بیان کا آئینہ دار ہے ، اور پھر یہ شعر اپنے رنگ میں اچھا بھی ہو تب بھی یہ پوری غزل غالب کی دوسری شاہکار غزلوں کے مقابل ہرگز اس کی مستحق نہیں کہ فارسی شعراء کے مقابلے پر اسے پیش کیا جائے ۔ سرسید نے

آثارالصنادید میں غالب کے اردو کلام کا جو طویل انتخاب درج کیا ہے اس میں اس غزل کا ایک شعر بھی نہیں لیا ۔ خود غالب نے اپنے اردو اور فارسی کلام کا جو انتخاب ۱۸۲۸ء میں گل رعنا کے نام سے مرتب کیا تھا اس میں اس غزل کا ایک شعر بھی منتخب نہیں کیا ۔ اس انتخاب کا حوالہ اس لئے اور بھی اہم ہے کہ یہ اسی اولین دور کا انتخاب ہے ، پھر جو انتخاب غالب نے ۱۸۶۶ء میں نواب رامپور کے لئے مرتب کیا تھا اس میں بھی اس غزل کی کوئی خاص حیثیت نہیں۔ دوسری غزلوں کے اشعار کا انتخاب تعداد اشعار کے لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے ۔

غرض 'رشک فارسی' میں فارسی کا اشارہ نہ غالب کے اپنے فارسی کلام کی طرف ہے ، نہ فارسی شاعری اور فارسی شعراء کے کلام کی طرف ۔ دراصل اس میں ایک تخصیصی اشارہ ہے، جس کا تعلق اس غزل کے پس منظر سے ہے جس کے فراہم کئے بغیر مقطع کا اصل مفہوم مخفی رہتا ہے ۔

گیارھویں صدی ھجری میں اصفہان کے ایک شاعر نواب باقر نے ایک نئی زمین نکالی تھی اور ایک طویل غزل کہی تھی جو اپنی ردیف کی ندرت کی وجہ سے مشہور ہوئی :

هر که ز حسن پرسدت دل بربا که هم چنین
و انکه زناز گویدت عشوه نما که هم چنین

گفتی تو گفتهٔ که من جان دهمش ببوسهٔ
گفته ام و چنین کنم حق خدا که هم چنین

هر که بپرسدت که چون مهر بر آید از افق
صبحدمے برون خرام از دل ما که هم چنین

هر که بگویدت که چون مهر بر آید از فلک
بند نقاب باز کن رخ بنما که هم چنین

هر که بپرسدت که چون مه ز خسوف وا شود
لطف نما و باز کن بند قبا که هم چنین

پرسد اگر کسی ز تو سرو و گل بهشت را
قد بنما که همچنان رخ بنما که هم چنین

پرسد اگر کسی که شه چون بگدا عطا کند
جانب ما نگاه کن راه خدا که هم چنین

پرسد اگر کسی هما بیضه چسان بر آورد
بر سر خال باز کن زلف دوتا که هم چنین

هر که بپرسدت که چون مهر به مه دهد سپر
در بر روی خود بنه آینه را که هم چنین

پرسد اگر کسی که چون سوی فلک رود نگهه
مردم چشم عاشقان زود بیا که هم چنین

کشمکش ارچه رو دهد مهر صفای دیدها
آینهٔ جمال را داد جلا که هم چنین

پرسد اگر کسی که چون مرده مسیح زنده کرد
بر سر خاک عاشقان لب بکشا که هم چنین

پرسد اگر کسے کے بے زنگ ز دل چسان برد
از دل ما بیک نگہ غم بزدا کے هم چنین

خواهد اگر کسے که چون بوی گل آید از چمن
رنجہ مشو ، گذار کن بر سر ما که هم چنین

پرسد اگر کسے ز تو راہ علاج خستگان
شربتے از لبت بده بهر دوا که هم چنین

گوید اگر کسے که چون شه بگدا نظر کند
ترک جفا و جور کن رحم نما کہ هم چنین

هر که بپرسدت که چون صید کنند مرغ را
زلف سیاه دام کن در رہ ما که هم چنین

پرسد اگر کسے ز تو حال دل شکستگان
بر سر سنگ خاره زن آینه را کہ هم چنین

پرسد اگر کسے ز من الفت روح و جسم را
تنگ در آرمش ببر همچو قبا که هم چنین

پرسد اگر کسے ز تو سرو جمال خلد را
مست شراب ناب شو خیز و بیا کہ هم چنین

پرسی اگر که چون کند باقر ما دعای ما
سوی فلک بر آورم کف به دعا که هم چنین[1]

نعمت خان عالی شیرازی نے جو اورنگ زیب کے عہد (گیارھویں صدی ہجری کے آخر اور بارھویں صدی کے شروع) کا فارسی نثر نگار اور شاعر ہے اسی زمین میں ایک مختصر مگر لطیف غزل کہی جو ہمارے معاشرے میں روایتی علم مجلس کے ذخیرے کی ایک نادر چیز رہی ہے۔ غالب کے زمانے میں اس کا اور بھی زیادہ چرچا رہا ہو گا:

هر که ز غنچه دم زند لب بکشا که هم چنین
هر که ز گل سخن کند رخ بنما که هم چنین

آب حیات را لبش خواست بمن بیان کند
معنیِ آن ببوسهٔ کرد ادا که هم چنین

از پیِ او روان شدم دست زدم بدامنش
کرد بمن تبسّمی رو بقفا که هم چنین

گر تو به خنجرِ جفا سر ز تنم کنی جدا
پا نه کشم من از وفا حقِّ خدا که هم چنین

هر که بگوید این سخن عمر دوباره چون بود
از برِ من دمے برو، باز بیا که هم چنین

---

۱ - یہ غزل ہم نے دیوان باقر اصفہانی کے قلمی نسخے سے نقل کی ہے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے شیرانی کلیکشن میں محفوظ ہے - یہ دیوان ابھی چھپا نہیں ہے -

گفتمش ای بہانہ جو لیست چو طور من نکو

طور پسند خود بگو بہر خدا کہ ہم چنین

یار بہ غالی حزین گفت چگونہ عاشقی

آہ کشید و جان خود کرد فدا کہ ہم چنین

بارھویں صدی ہجری کے آخر اور تیرھویں صدی ہجری کے شروع میں رتن سنگھ زخمی[1] کے دیوان میں بھی اس زمین کی غزل ملتی ھے ، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس زمین کی دلکشی گیارھویں صدی ہجری سے تیرھویں صدی ہجری تک ادب پر اثر انداز رہی ۔ اس فارسی زمین کو غالب نے پوری کامیابی سے اردو میں ڈھالا، اگرچہ اس کا مزاج وھی رہا جو فارسی میں تھا یعنی معاملہ بندی ۔ اگر چہ غالب کی فکر کو بھی معاملے ھی کے دائرے میں محدود رھنا پڑا ، لیکن پھر بھی غالب نے اس کا کامیاب ثبوت پیش کر دیا کہ اردو میں بھی اس طرح کی چیز کامیابی سے کہی جا سکتی ہے ، بلکہ غالب نے در حقیقت فن کے لحاظ سے زیادہ کامیاب تخلیق پیش کی ہے اور اسی لئے غزل کے آخر میں دعویٰ کیا ھے :

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ھو رشک فارسی

گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کے یوں

یعنی سننے والے کو قائل کرنے کے لیے غزل کا صرف پڑھ کر سنا دینا کافی ہو گا ۔ کسی تبصرے اور استدلال کی ضرورت نہیں اور وہ بھی صرف ایک بار پڑھ دینا کافی ھے

1 ۔ زخمی کا قلمی دیوان پنجاب یونیورسٹی کے شیرانی کلیکشن میں محفوظ ہے ۔

سننے والا ایمان لے آئے گا۔

غرض یہ مقطع کہتے وقت غالب کے ذہن میں صرف یہی فارسی غزلیں تھیں، جو اس زمین میں کہی گئی تھیں اور انہیں سے مقابلہ مقصود تھا ، بلکہ نعمت خان عالی کی غزل خاص طور پر ان کی نظر میں ہو گی ۔

یہ سب جانتے ہیں کہ اگر چہ غالب کے کلام میں معاملات عشق کے شاہکار اشعار ملتے ہیں، لیکن وہ معاملہ بندی کے شاعر نہیں ۔ ان کی اس غزل کا محرک ان کے معاشرہ کا علم مجلسی ہے، جس میں بعض مشہور روایتی چیزوں کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی تھی ، بلکہ غالب کے اپنے قریبی ماحول میں ان کے خسر نواب الہی بخش خان معروف کے دیوان کی غزل اسی زمین میں ہے جو اس کا مزید ثبوت ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس غزل کے لئے فکری تحریک میں معروف کی بھی شرکت ہو اور چونکہ معروف کی غزل اس زمین کی فارسی غزلوں کا کامیاب مقابلہ نہیں کرتی ، خاص طور سے نعمت خان عالی کی غزل کا ، اس لئے غالب کو اپنی غزل میں یہ اشارہ کرنا پڑا " ۔ ۔ ۔ ریختہ کیونکہ ہو فارسی " ۔

معروف کی غزل یہ ہے :

کیونکہ بہم ہوں مہر و مہ پوچھیں تو مت بتا کہ یوں
جب شب مہ ہو مہروش، منہ سے نقاب اٹھا کہ یوں

کوندے ہے برق کس طرح پوچھیں تو مت بتا کہ یوں
منہ کو چھپا کہ کھولدے، کھول کے پھر چھپا کہ یوں

جو یہ کہے کہ جذب عشق کیونکر اثر دکھائے ہے
میرے گھر آ اور اپنے ساتھ اس کو بھی کھینچ لا کہ یوں

کوئی اگر کہے کہ تو لیتا ہے کس طرح سے دل
میری بغل میں بیٹھ جا اور اسے بتا کہ یوں

گر یہ کہیں کہ بعدِ مرگ دیجے کسی کو کیونکہ دکھ
غیر کے ساتھ ایک بار قبر پہ میری آ کہ یوں

کیسے نگاہِ یار سے گر گئے، جب کیا سوال
قطرۂ اشک ایک بار چشم سے گر پڑا کہ یوں

ذکر یہ تھا کہ کھینچے ہے کاہ کو کیونکہ کہربا
اس میں یہ ناتواں وہاں آ جو گیا کہا کہ یوں

گرمیٔ خو کا تیری ذکر میں نے کیا جو شمع سے
سنتے ہی اتنی بات کو شعلہ بھی کانپ اٹھا کہ یوں

پوچھا جو اس سے کس طرح خاک میں مل گیا وہ شخص
نام مرا زمین پر لکھکے مٹا دیا کہ یوں

دیکھو تو میرا حوصلہ سنتے ہی اتنی بات کے
مر تو گیا پہ شرم سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ یوں

ذکر چلا کہ یار بن جیتے ہیں یار کس طرح
بس یہ الٰہی بخش نے سنتے ہی رو دیا کہ یوں

غالب کے ایک فارسی خط سے جو پنج آہنگ میں شامل ہے ان کے اس خیال کا پتہ چلتا ہے کہ وہ معاملہ بندی خاص طور سے واسوخت اور ریختی والی معاملہ بندی کے لئے اردو زبان کو فارسی سے زیادہ موزوں سمجھتے تھے اور ان مضامین کو فارسی زبان کے دون مرتبت جانتے تھے ۔ اس طرح کی معاملہ بندی کے بارے میں انہوں نے کہا ہے : ''این گونہ ترہات در نورد گفتار پارسی زبان صورت قبول نگیرد،، اور یہ بھی کہا ہے ''شان پہلوی و پارسی بلند تر از آنست کہ بدین پایہ فرودش آورند،،

غالب کے نزدیک ریختہ اس محدود دائرے میں رشک فارسی بن سکتی تھی ۔

ڈاکٹر محمد اجمل

غالب کا ذوق سفر

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے فکر انگیز اور دل آویز مضمون ''غالب کی آوارہ خرامی،، میں غالب کے مزاج کی بے قراری اور نقل مکانی اور سیر و سیاحت کے شوق کی ان کے آبا کی خانہ بدوشی اور آبائی خون کی گرمی اور تلملاہٹ سے توجیہہ کی ہے ، لیکن احتیاطاً یہ بھی کہا ہے '' اس بے قراری میں ایک بڑا حصہ ان کے آبائی خون کی گرمی اور تلملاہٹ کا بھی ہے،،۔ ''بڑا حصہ،، کی حزم آمیز ترکیب کی بدولت مجھے اس بے قراری کی نفسیاتی تعبیر کرنے کی جرأت ہوئی کہ اس میں ''کچھ حصہ،، یقیناً نفسیاتی عوامل کا رہین منت ہے ۔

ذوق سفر کا ایک پہلو تو ایجابی ہے ، صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ نے بہت سے سفر محض اس غرض سے کئے کہ علم حاصل کریں اور مختلف بزرگوں کی صحبت میں عرفان کے اعلیٰ مدارج طے کریں ، اس سفر کی غرض و غایت داخلی دنیا کے مختلف صحراؤں ، سرابوں اور نخلستانوں سے گزرنا تھا اس کا دوسرا مقصد ترک عادت تھا ''ترک مال و ترک جاہ و ترک سر،،

گر رہبر تست عادت خویش مردود و منافقی نہ درویش

ہر عادت کی شکست سے روح کا کوئی خوابیدہ گوشہ بیدار ہوتا ہے ، اور ہر سکون بخش فطرت ثانیہ کے ٹوٹنے سے اصلی فطرت کے بہت سے تاریک نہاں خانے روشن ہو جاتے ہیں ۔ ''مطالب رشیدی،، میں سفر کی چار اقسام بیان کی گئی ہیں ۔ (۱) عوام کا سفر جو کسی مادی ضرورت کے حصول کے لئے کیا جائے (۲) عابدوں کا سفر جو طالب علم اور عبرت کے لئے سیر کیا کرتے ہیں (۳) سالک کا سفر ۔ دل کی مسافرت ہے ۔

ع بنشین و سفر کن کہ نہایت خوب است

سالک اپنے سے الگ ہوکر سیر الی اللہ کرتا رہتا ہے اور ایسے مسافر کا قول ہے

ع از خویش گذشتم چہ مبارک سفرے بود

(۴) کامل کا سفر، سفر در وطن ہے ''یہ مقامات میں ہے کہ جزو سے کل کی طرف اور عالم سفلی سے عالم علوی کی طرف ہوتا ہے،، (صفحہ ۱۶)

غالب کے ذوق سفر میں پہلی قسم کے سفر کے لئے طلب زیادہ ہے اور دوسری قسم کے سفر کا ذوق بھی موجود ہے مگر دھیما اور کم کم ۔ تیسری اور چوتھی قسموں کے سفر کا ان پر اطلاق نہیں ہوتا، پہلی قسم کے سفر میں مادی احتیاج جو اکثر ایک خلش بے چینی یا بے قراری کی صورت اختیار کرتا ہے محرک سفر بنتا ہے ۔ اس کی تہ میں یہ مفروضہ کار فرما ہوتا ہے کہ یہاں سے وہاں پہنچنے پر سکون میسرہوگا، جس طرح بعض بے چین روحوں کو ہر پہاڑ کے نظارے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کو پہاڑ کی دوسری طرف سکون ملے گا ۔ سفر چاہے فرار ہو چاہے کسی چیز یا شخص کا تعاقب اس کا مقصد حالات کی تبدیلی ہے، یہاں میں ایک اور فرضیے کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ ہر سفر کی تحریک اپنی شخصیت کے بدلنے کی آرزو سے ہوتی ہے، ہر سفر شخصی نشو و نما کے مرحلے طے کرنے کی امنگ کا اظہار ھے، اسے میں ایک بنیادی حقیقت سمجھتا ہوں کہ سفر کی نخستمثال ہر شخص کے ذہن کی ترکیب اور ساخت میں موجود ہے، لیکن بعض لوگ اس کے تقاضوں کو روحانی سطح پر پورا کرتے ھیں اور اکثر لوگ اسے حظوظ حسی و تحسیسی کے حصول کے لئے سفلی سطح پر استعمال کرتے ھیں ۔ اور روحانی سطح کو نظر انداز کر جاتے ھیں ۔

اس سے پہلے کہ ہم سفر کے ایجابی پہلوؤں کے نقطہ نظر سے غالب کی شخصیت اور کلام کو دیکھیں ۔ ہم اس رحجان کا مطالعہ کر لیں جو غالب کو یہ مجبور کرتا ہے کہ وہ بعض حالات وکوائف کو ''زندان،، سے تعبیرکرنے . . . وزیر آغا نے ان کے ایک خط (بنام مرزا علاءالدین) سے ایک اقتباس . ش کیا ہے :-

ر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں ۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ء میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا ۔ تیرہ برس حوالات میں رہا ۔ ے رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام صادر ہوا ۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا ۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھیرایا برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا ۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا ۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اس مجلس میں بٹھا دیا ۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریزپا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں ۔ پاؤں بیڑی سے فگار ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار مشقت مقررہ اور مشکل ہوگئی طاقت یک قلم زائل ہوگئی بے حیا ہوں کہ جیتا ہوں سال گذشتہ بیڑی کو زاویہ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا میرٹھ ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا ۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا ۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا بھاگوں کیا ؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی،،

(جون ۱۸۶۱ ع)

پھر ایک جگہ بیوی کو بھی ''بیڑی،، ''پھانسی،، کہا ہے :

''امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے ۔ اللہ اللہ !! ایک وہ ہیں کہ دو دو بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے ، نہ دم ہی نکلتا ہے ۔،،

(یاد گار غالب صفحہ ۱۳۸)

نواب رام پور کو ۱۴ اپریل ۱۸۶۷ع کو لکھتے ہیں :-

''نمائش گاہ سراسر نور رام پور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں اور خون جگر کھاتا ہوں کہ ہائے میں وہاں نہیں ۔ بالا خانے پر رہتا ہوں ۔ اتر نہیں سکتا ۔

مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتاار اور پالکی میں بٹھادیا ۔ کہار لے کر چلے، راہ میں نہ مرا اور رام پور پہنچ گیا ۔ کہاروں نے جا کربے نظیر میں میری پالکی رکھ دی ۔ پالکی قفس اور طائر اسیر ، وہ بھی بے پر و بال نہ چل سکوں نہ پھر سکوں،،

غالب دھلی کو بیوی کو اور آخیر میں پالکی کو بھی قفس سمجھتے ھیں ۔

پھر ایک رباعی میں کہتے ھیں ۔

زانجا کہ دلم بہ وھم دربند نبود　　با ھیچ علاقہ سخت پیولد لبود
مقصود من از کعبہ و آھنگ سفر　　جز ترک دیارو زن و فرزند نبود

ان احساسات کے باوجود غالب کے ھاں سفر کا تصور ''وطن،، کے تصور سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ۔

تا رغبت وطن نبود از سفر چہ حظ
آنرا کہ نیست خانہ بہ شہراز خبر چہ حظ

اس کے علاوہ جب کبھی سفر پر جاتے ھیں وطن کی یاد انہیں بہت ستاتی ھے ۔ احباب کو خط لکھتے ھیں اور ان کے خطوں کے منتظر رہتے ھیں ۔ اگر کوئی دوست خط نہ لکھے تو بگڑ جاتے ھیں ، یہ سفر ''ھر ملک ملک ماست،، والا سفر نہیں ھوتا تھا ، بلکہ اس کی غرض وطن سے بھاگنا اور وطن کو واپس لوٹ آنا ھوتا تھا ۔ سفر کے ھر مقام پر وطن کی یادوں کی چاپ ان کے ذھن کا تعاقب کرتی اور یہ پرانی آھٹیں ان کے حالیہ ادراک کو بھی متاثر کرتی تھیں ۔ چنانچہ ''چراغ دیر،، میں بنارس کی تعریف کرتے ھوئے کتنے درد کے ساتھ کہتے ھیں ۔

کس از اھل وطن غمخوار من نیست
مرا در دھر پندار وطن نیست

اور پھر ایک غزل کا مقطع ھے

کرتے کس منہ سے ھو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ یاران وطن یاد نہیں

اسی مثنوی میں بنارس کو دل دینے کے بعد فوراً دهلی کا خیال آتا ہے

بکاشی لختے از کاشانه یاد آر ـــ دربن جنت ازان ویرانه یاد آر
دریغا در وطن وامانده ٔ پند ـــ بخون دیده زوزق مانده ٔ چند
هوس را پائے در دامن شکسته ـــ بامید تو چشم از خویش بسته
بشهر از بیکسی صحرا نشینان ـــ بروئے آتش دل جا گزینان
هم در خاک و خون افگنده ٔ تو ـــ بحکم بیکسی ها بنده ٔ تو
چو شمع از داغ دل آذر نشانان ـــ به بزم عرض دعوی بے زبانان

از آنانت تغافل خوشنما نیست
به دافع شان هوائے گل روانیست

جن لوگوں کا اس مثنوی میں ذکر ہے ، یہ وهی اعزاء هیں جن سے غالب فرار کرکے آیا تھا اور اگر غور سے دیکھیں که غالب ان کی بیکسی کا جو نقشه کھینچتا ہے وہ دراصل اس کی اپنی حالت کی غمازی کرتا ہے ۔ اهالیان وطن کا حال غالب کے بغیر تو شاید دردناک هوتا یا نه هوتا ، غالب کی اهل وطن کے بغیر حالت نهایت الم ناک تھی ، اور آخر میں جب کلکتے سے بیزار هوتے هیں تو کہتے هیں -

حال کلکته باز جستم و گفت ـــ باید اقلیم تسخیرش گفتن
گفتم اینجا چه شغل سود دهد ـــ گفت از هر که هست ترسیدن
گفتم این جا چه کار باید کرد ـــ گفت قطع‌نظر ز شعر و سخن
گفتم از بهر داد آمده ام ـــ گفت بگریز و سر به سنگ مزن

ڈاکٹر وزیر آغا نے غالب کی آواره خرامی کے ثبوت میں یه شعر نقل کیا ہے :

مقطع سلسله ٔ شوق نہیں ہے یه شهر
عزم سیر نجف و طوف حرم ہے هم کو

لیکن یہ شعر اس غزل میں معتمد الدولہ کے رویہ سے مایوس ہو کر ڈال دئیے گئے جب معتمدالدولہ سے ہمدردی کی توقع تھی اس وقت یہ شعر اس غزل میں نہیں تھا بلکہ یہ اشعار تھے

طاقت رنج سفرھی نہیں پاتے ، اتنا — ہجر یاران وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمدالدولہ بہادر کی امید — جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

غالب کے ہاں ذوق سفر بھی ہے ، بیم سفر بھی ہے ، حب وطن بھی ہے اور ترک وطن کی ایک مستقل آرزو بھی ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس دو جذبی کیفیت کی نفسیاتی تعبیر کیا ہے ، غالب وطن کو مرکز بنا کر ادھر ادھر گھومنے نکلتا ہے لیکن جونہی وطن سے کچھ دور جاتا ہے اسے احباب اور عزیزوں کی یاد ستانے لگتی ہے ، وطن اس کا آشیانہ ہے ، اور وہ اپنی پرواز میں اسے ذہن سے اوجھل نہیں ہونے دیتا ، اس دو جذبیت کے تفہیم کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ''وطن (یا شہر کہیئے) اور قفس کو نفسیاتی علامتیں سمجھیں ، اور اسی طرح غالب کے ذوق سفر کو بھی انہی علامتوں کے تفاعل کا ایک نتیجہ ۔

شہر دراصل مادر عظمیٰ کی علامت ہے ، اور شہر سے فرار کرنا مادر عظمیٰ کے سلبی پہلو سے فرار کرنا ہے ، یعنی اپنی شخصیت کے بنیادی عین سے فرار کرنا ہے ، بے چینی اور بے قراری اس فرار کا پیش خیمہ ہیں ۔

شہر ماں کی علامت ہے ، مثلا ایک خط میں لکھا ہے ''مگر یروشلم جو کہ ہمارے اوپر ہے آزاد ہے اور ہم سب کی ماں ہے'' اور مکاشفہ میں لکھا ہے :

''اور اس کے ماتھے پر ایک نام لکھا تھا سرا سر راز ، بابل اعظم ، طوائفوں اور ارضی گناہوں کی مادر عظمیٰ''

خروج میں لکھا ہے

''بابل اعظم گر گئی ہے ، اور شیطانوں کی آماج گاہ ، رذیل روح کا مسکن اور ہر غلیظ اور قابل نفرت پرندے کا پنجرہ بن گئی ہے ۔

کیونکہ تمام قوموں نے اس کے ساتھ زنا کا بادۂ عتاب پیا ہے ، اور دنیا کے سلاطین نے اس کے ساتھ ہم بستری کی ہے،، مادر عظمیٰ سے فرار خانہ بدوشی کی وہ کیفیت پیدا کرتا ہے جس میں انسان کسی جگہ بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا ، وطن سے دور جاتا ہے تو وطن کی یاد ستاتی ہے ۔ غالب کے ہاں یہ بے قراری بھی ہے اور سفر کے دوران وطن کی یاد بھی ۔ اسی لئے وہ خط بھی بہت لکھتے ہیں اور ہجر میں وصال کا مزہ لیتے ہیں ۔ ماں سے اس طرح فرار کی ایک علامت جنسی ہیجانات کا غلبہ بھی ہے لیکن توقعات اتنی نازک اور اتنی ناقابل تکمیل ہوتی ہیں کہ ہر قدم پر احساسات کے مجروح ہونے کا خدشہ رہتا ہے ۔ مثلاً ''چراغ دیر،، میں بنارس کی تعریف کرتے ہیں ۔ دیکھیئے یہ مدح کس قدر جنسی ہیجان سے لبریز ہے ۔

زرنگین جلوہ‌ها غارت گر ہوش ۔۔۔ بہار بستر و نوروز آغوش
ز تاب جلوہ خویش آتش افروز ۔۔۔ بتان بت پرست و برہمن سوز
بسا مان دو عالم گلستان رنگ ۔۔۔ ز تاب رخ چراغان لب گنگ
رسانده از ادای شست و شوئی ۔۔۔ بہر موجے نوید آبروئی
قیامت قامتاں مژگاں درازاں ۔۔۔ ز مژگاں بر صف دل نیزہ بازاں
فتادہ شور شے در قالب آب ۔۔۔ ز ماهی صددلش در سینه بیتاب
ز بس عرض تمنا میکند گنگ ۔۔۔ ز موج آغوشہا وا میکند گنگ

(کلیات غالب صفحہ ۶۲۵-۶۲۴)

اس مثنوی میں نہ بنارس کی قدیم اور حسین عمارتوں کا ذکر ہے ۔ نہ ہندو ثقافت اور تہذیب کا بیان ہے ، فقط بیان ہے تو عورتوں کے حسن کا ، اور کس قدر دل فریب اور حواس افروز بیان ہے ۔ قیامت قامتاں مژگاں درازاں ، اور پھر دیکھئے حسن طلب کی سادگی و پرکاری کہ اپنی تمنا کو گنگا کی موجوں کے سپرد کر دیتے ہیں ۔ ''گنگا میا،، کی موجیں اپنی آغوش ان حسینوں کے لئے کھول دیتی ہیں ۔

یہی ہیجان غالب پر کلکتے میں بھی طاری ہوتا ہے ، ایک خط میں لکھتے ہیں (واپسی کے بعد)

''من بخدا اگر متاھل نبود مے و طوق ناموس عیال نداشتمے ۔ دامن بر ہر چہ ہست افشاند مے و خود را دران عقد رساندمے ، تا زیستمے دران مینو کدہ بودمے و از رنج ھوا ھائے خاموش آسو دمے''

پھر کلکتے کے ذکر والی مشہور غزل میں کہتے ہیں ۔

وہ سبزہ زار ھائے مطرا کہ ہے غضب وہ نازنیں ، بتان خود آرا کہ ھائے ھائے
صبر آزما وہ ان کی نگاھیں کہ حف نظر طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ھائے ھائے

وطن (ماں) سے فرار کرتے ہیں ، تو عالم رنگ و بو ایک حسینہ کا روپ دھارتی ھے اور وہ حسینہ دعوت جنس دیتی ہے ۔ اپنے جنسی ہیجان کا اعتراف کرتے ھیں ۔ تو فوراً وطن کی یاد ان کو ستاتی ھے اور سفر کا المناک پہلو ان کی نگاھوں کے سامنے آ جاتا ہے ۔ اس پہلو کا ایک اظہار ایک قصیدے میں یوں ھوا ہے ۔

تا نباشد المے ترکِ وطن نتواں کرد مشکلے در نظر آوردم و آسان رفتم
چہرہ اندوہ بگرد و مژہ آغشتہ بخوں خود گواھم کہ ز دھلی بہ چہ عنوان رفتم
اضطرار آئینہ پرداز جلائے وطن است نہ بدل رفتم ازان بقعہ بل از جان رفتم

دھلی جو کہ غالب کے لئے زندان ھے اور اس کی ھتھکڑیاں اور بیڑیاں اس کے لئے سوھان روح ھیں ، وھی دھلی غربت میں غالب کے لئے ایک ھی پناہ گاہ ہے ۔ ذرا کسی توقع کو ٹھیس لگی یا کوئی امید ٹوٹی تو انہیں جہاں آباد کی صحبتیں یاد آئیں ۔ دوست اور عزیز یاد آئے ۔ سفر اجیرن ھو گیا اور نیا شہر ایک نیا زندان بن گیا ۔ دھلی کے لئے یہ جذبیت مادر سلبی کی نخستمثال کی آئینہ دار ہے ، اس دو جذبیت کی نوعیت کو واضح کرنے کے لئے میر تقی میر کا وہ ھدیۂ عقیدت ہے جو انہوں نے دھلی سے بچھڑنے کے بعد دھلی کو بھیجا تھا جو اس جذبۂ نیاز و عبادت سے لبریز ھے جو کالی ماتا کے پجاری کالی ماتا کے لئے دلوں میں محفوظ

رکھتے ھیں ۔ اور گاھے گاھے اس کا اظہار بھی کرتے ھیں ۔ میر باد صبا سے مخاطب ھو کر کہتے ھیں "کہ اگر دلی کی طرف تیرا گزر ھو تو میری طرف سے ھر قدم پر بوسہ دینا ۔ ھر مقبرے پر آیۂ رحمت پڑھنا ۔ ھر مسجد کو میرا سلام کہنا ۔ نئی نئی پیشانیاں پیدا کرکے ھر دروازے پر سجدہ کرنا ۔ ھر گلی کے سامنے ٹھہر کر در و بام پر مسرت کی نگاہ ڈالنا ، ھر مصیبت زدہ کو میری طرف سے یاد کرنا ۔ ھر دیوار کے نیچے رک کر فریاد کرنا ، میرے دوستوں کو تلاش کرنا ، اور حسن نظر آئے تو اس تک میرا عشق پہنچا دینا اور اس کے بعد ان سب کو میری داستان سنانا۔"

یہ رویہ وطن کے بارے میں یک جذبی اور یکسوئی کے احساس سے آراستہ ھے یہ مادر عظمیٰ کی قبولیت کا احساس ھے ۔ اس سے تنافر اور الفت کے جذبات کی دو بدھا نہیں ۔ ایک ھاتھ سے اپنی طرف کھینچنے اور دوسرے ھاتھ سے دھکیلنے کا احساس نہیں ھوتا ، وصل کی تمنا میں کڑھنے اور دل گیر رھنے کے بعد اگر وصل ھو جائے تو ھجر کی راھیں تلاش کرنے کی طلب معلوم نہیں ھوتی ، لیکن یہ طلب غالب میں بدرجۂ اتم موجود ہے ، ماں سے بھاگتا ھے لیکن بھاگ جانے کے بعد اس کی آغوش کے لئے تڑپتا ھے ، تلملاتا ہے ۔ مادر سلبی سے اس لئے بھاگتا ھے تاکہ مادر ایجابی تک رسائی حاصل کرے ۔ بنارس ھو یا کلکتہ جب وہ ان توقعات کو نہیں لگاتے ھیں جو وہ مادر ایجابی سے رکھتا ھے تو فوراً اس کے ذھن میں نیا شہر مادر سلبی بن جاتا ھے اور دھلی مادر ایجابی ۔ دھلی واپس آتا ھے تو بنارس اور کلکتے کو پھر یاد کرنے لگتا ہے ۔

مادر سلبی کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے چاھنے والوں کی روحوں کو پارہ پارہ کر دیتی ہے ' انسانی تعلقات کے گلو میں زھر بھرتی ہے اور مردوں سے مردانگی اور انسانوں سے انسانیت چھین لیتی ہے ۔ ذھنی ارتقا میں یہ نوشابی کی اولین منازل میں سے ہے ، بنارس کے حسن کو بیان کرنے کے فوراً بعد فرماتے ھیں ۔ بنارس کی مدح میں آخری اشعار یہ ھیں ۔

بیابان در بیابان لاله زارش — گلستان در گلستان نو بهارش
شبے پرسیدم از روشن بیانے — ز گرد شہائیے گردون راز دانے
که بینی نیکوئی ها از جهان رفت — وفا و مهر و آزرم از میان رفت
زایما تہا بجز نامے نمانده — بغیر از دانه و دامے نمانده
پدرها تشنهٔ خون پسرها — پسرها دشمن جان پدرها
برادر با بردار در ستیز است — وفاق از شش جهت رو در گریز است
بدین بے پرد گیای علامت — چرا پیدا نمی گردر قیامت

اس کے فوراً بعد یہ بزرگ ''غالب کار اوفتادہ،، کو ان کی تحسین بنارس پر لعن طعن کرتے ہیں ۔ اور فرماتے ہیں ۔

چه جوئی جلوه زین رنگین چمنها — بهشت خویش شو از خون شدنها
جنونت گر بنفس خود تمام است — ز کاشی تا بکاشان نیم گام است

یہ بزرگ کون ہیں ؟ یہ مرد پیر دانا (wise oldman) کی لخستمثال ہے جو پہلے غالب پر تنقید و تنقیص کر کے اسے درون بینی کا سبق دیتی ھے کہ کیا رکھا ھے اس ''جنت نگاہ،، میں تو اپنے دل کی دنیا کی جنت تعمیر کر ۔ فوراً مثنوی کا رنگ بدل جاتا ہے ، اب آگے غالب صیغہ امر زیادہ استعمال کرتے ہیں گویا مادر عظمیٰ کی محرکات کے خلاف مرد پیر دانا پندو نصیحت کرنے لگا ھے اور غالباً غالب کے سارے کلام میں جہاں صیغہ امر یا صیغہ نہی آیا ہے شعروں کی کیفیت ہی کچھ اور ہے ۔ ذہنی سطح پر غالب کا ذوق سفر ہمیشہ مادر عظمیٰ سے پدر اعلیٰ کی طرف رہا ہے ۔ ہر شہر ، ہر قیام گاہ ، ہر منزل ان کے لئے قفس ہے اور بہت کم ''قفس،، کی کیفیتوں کو برداشت کرتے ہیں ۔ وہ بے چینی اور اضطراب کی حالت میں وہاں سے دوڑنا چاہتے ہیں اور بھاگتے ہیں باپ کی طرف ۔ ''چراغ دیر،، میں وہ بنارس کے حسن و جمال کو نہایت حسین اور ہیجانی انداز سے بیان کرتے ہیں لیکن فوراً بعد اس مثنوی کا لہجہ بدل جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنسی ہیجان پر پند و نصیحت کے تازیانے لگا رہے ہیں ۔ اور عارفانہ انداز میں حقائق نفس

کا ذکر کرتے ھیں اور اسی باب کی یہ آواز معلوم ھوتی ہے :-

قفس و دام را گناھے نیست　　　ریختن در نہاد بال و پر است

اسی غزل کے آخر میں کیا بلند بات کہی ہے :-

کم خود گیر و بیش شو غالب　　　قطرہ از ترک خویشتن گہر است

(× جلد اول صفحہ ۲۶۹)

یہ روحانی آواز جا بجا سنائی دیتی ھے -

مثنوی ''رنگ و بو،، میں جب بادشاہ ایک ستم زدہ (شاعر) کے ساتھ رحم و کرم کا سلوک روا رکھتا ہے تو اس رات بادشاہ خواب میں

دید ز تمثال سراپائی حور　　　ریخت گل جلوہ بجیب شعور

یہ ''حور،، بظاھر تو ''تصویر زن،، ہے لیکن یہ بادشاہ کی دولت و ثروت کی علامت ہے - اور یہ علامت خواب میں ابھرتی ہے اور بادشاہ کو اس کی غیر دانشمندانہ حرکت یعنی گلیم خریدنے اور اسے شاھی خزانے میں محفوظ رکھنے پر لعن طعن کرتی ہے -

بوئے گلیمے بدما غم زدی　　　سیلی صر صر بچراغم زدی

اور آخر میں کہتی ہے

رفتم و وارستم از آزار تو　　　باد ، خدای تو نگہدارتو

اس کے بعد جلوہ دیگر نمودار ھوتا ھے -

ھیکلے از کوہ تنومند تر　　　بودہ ازو جہنہ الوند تر

یہ بادشاہ کی ' قوت نیرو ' اور ' طاقت سرپنجہ ' بازو ہے اور یہ بھی بادشاہ کی اس ناسزا حرکت پر بادشاہ سے رخصت ھو جاتا ہے - یہ تمثال غالباً بادشاہ کا '' ظل سلبی '' ہے جو ظاھری قوت و طاقت و توانائی کی ترجمانی کرتا ہے لیکن اس تمثال کے جانے کے بعد ایک اور جلوہ نظر آتا ھے یہ واضح نہیں ھوا کہ وہ جلوہ عورت کا ہے یا مرد کا یا کسی دو جنسی شخصیت کا - اس کے حسن و جمال کے

بیان میں غالب اپنے مخصوص اور ممتاز انداز میں کہتے ہیں ۔

رنگ گل آئینہ دیدار او   موج پڑے جوہر رفتار او

جلوہ جنت زغبارش رمے   چشمہ کوثرز محیطش نمے

اور آخر میں یہ کہہ کر بادشاہ کی ڈھارس بندھاتا ہے ۔

جان وفا زندہ ببوی تو باد   جلوہ من غازہ روی تو باد

یہ تمثال روح کی کونسی طاقت کا جلوہ ہے ۔ بظاہر یہ مرد پیر دانا کی علامت ہے ، جو نورانی اور معصوم ہے جو اپنی حکمت و درایت کے باوجود طفلانہ سادگی اور بے نیازی کے اوصاف سے آراستہ ہے ۔ وہ کیا نصیحت کرتا ہے ، اس کی نصیحت میں احتساب نفس کی دعوت ہے ، اس کی باتوں کی تہہ میں غالب کی وہ خوابیدہ آرزو جھلکتی ہے کہ وہ اعلے روحانی مدراج طے کرے اور مادر سلی کی اسیری سے نجات حاصل کرے ۔ دیکھئے کتنے بلند عزائم اور کتنے حسین اور عظیم افکار ہیں جن کو غالب اپنے اظہار کے منفرد سانچوں میں ڈھالتا ہے ۔

ہمچو من آزاد و سبکبار شو   در ہمہ و ہیچ خریدار شو

در شو و بر روئے وفا کار باش   در رہ دل خانہ بر انداز باش

در دل از آزار دل اندیشہ کن   گنج بر افشاں و کرم پیشہ کن

اس کے بعد غالب اپنی ہوس پرستی اور جاہ طلبی کے مختلف پہلوؤں کو ہمت اور بے باکی سے بیان کرتے ہیں اور دنیا کی بے ثباتی کے پس منظر میں ہر ہوس ناکی کو بے حاصلی اور ناکامی متصور کرتے ہیں ۔ لیکن آخر میں نفی ہوس کے بارے میں نہایت حسین پیرائے میں چند شعر کہتے ہیں اور اعلان " لا " کی ضرورت کا شدت اور تندی سے اظہار کرتے ہیں ۔

مثنوی ' سرمئہ بینش ، دیکھئے یا مثنوی " درد و داغ ، " ان میں مرد پیر دانا کی تمثال پورے وفور اور پورے جوش کے ساتھ ابھرتی اور پھیلتی نظر آتی ہے ۔ لیکن وہ ہمیشہ ایک آمرانہ رنگ لئے ہوتی ہے ۔ وہ نصیحت کرتی ہے

روح کے ممکنات کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ لیکن یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ غالب نے روح کی آواز کو روح کے کانوں سے سنا ہے یا یہ کوشش کی ہے کہ یہ آمرانہ انداز روحانی کیفیت میں بدل کر بیانیہ انداز بن جائے ، ناصح کے متعلق غالب کا یہ شعر اس کے اصلی رویے کی ترجمانی کرتا ہے

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

غالب کا ذوق سفر مادر سلبی (قفس ۔ زنداں) سے فرار کرنے کی آرزو پر استوار ہے ۔ وہ سفر کرتا ہے لیکن اس کی علامتی حیثیت سے انکار کر کے روحانی سطح پر وہ مادر سلبی سے " مرد پیر دانا " کی طرف سفر کرنا چاہتا ہے ، اپنی ہوسناکی سے گزر کر وہ اس مقام پر پہنچنا چاہتا ہے جس کے متعلق وہ خود کہتا ہے

کم خود گیر و بیش شو غالب   قطرہ از ترک خویشتن گہر است

کتنا حسین اور اور بلند شعر ہے " کم " اور " بیش " کا اتنا حسین استعمال شاید ہی کہیں اور ملے ۔ یہ " ترک خویشتن " ترک ہوس ، ترک حب جاہ و جلال اور ترک گدیہ‌گری ہے ۔ غالب اس مقام پر نہیں پہنچے جہاں کم و بیش کا امتیاز بے معنی ہو جاتا ہے ۔ مثلاً اقبال کے ہاں دیکھئے ۔

گر خدا داری زغم آزاد شو   از خیال بیش و کم آزاد شو

لیکن انداز پھر آمرانہ ہے ناصحانہ ہے احساس یہ ہوتا ہے کہ علامتی اور داخلی سطح پر غالب کم سے بیش کی طرف انتقال کرنے سے گریزاں تھا اور آرزوئے سفر محض جسمانی سفر کی تمنا بن کر رہ گئی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے ہاں تقریباً ہر روحانی علامت کی تضحیک یا تردید ملتی ہے ۔ مثلاً

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے
لازم نہیں کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ کہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

وغیرہ وغیرہ

علامتی سطح پر سفر کرنے کے لئے جس قسم کی داخلیت ضروری ہے غالب اس سے بہت حد تک نابلد تھے ، ان کے اندر ایک اضطراب ایک مستقل بے قراری تھی جو اکثر انہیں نقل مکانی اور سفر پر آمادہ کرتی لیکن وہ کہیں بھی خوش اور مطمئن نہیں رہے ، قرائن سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ ان کا ذوق سفر بنیادی طور پر علامتی تھا لیکن انہوں نے ہمیشہ اسے اس بلند سطح سے نیچے کھینچا اور محض جسمانی سفر کا درجہ دے دیا ۔ میرے خیال میں تو نہ یہ آبائی خون کی گرمی تھی اور نہ خانہ بدوشی کی روایت کا اثر ۔ بلکہ مادر سلبی کے کرخت اور تند بازوؤں میں جکڑے ہوئے انسان کی گھٹن تھی جو غالب کو فرار کی راہیں سجھاتی تھی ، وہ چاہتے تھے کہ وہ "مرد دانا" کو اپنا لیں ، لیکن یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اسے کبھی بھی اپنا سکے ہیں ۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

لئے جاتی ھے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

غالب کا ایک شعر

نقش فریادی ہے کسی کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

غالب کے اس شعر کے سلسلہ میں شارحین نے خاصے اختلاف کا ثبوت دیا ہے۔ نظم طبا طبائی سے لیکر دور حاضر کے شارحین تک توضیحات و تشریحات کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ ہے۔ اس سلسلہ میں غالب نے جو وضاحت کی ہے وہ شعر کے مطالب کی مختلف تہوں سے متعلق نہیں بلکہ محض کاغذی پیرہن کی ترکیب سے متعلق ہے۔ ایران کی ایک رسم قدیم کا یہ حوالہ کہ دربار میں داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا اور یہ صورت فریاد اور داد خواہی کی تھی شعر کی توضیح کرنے سے قاصر ہے۔ کاغذی پیرہن سے مراد کسی چیز کے عارضی اور اعتباری ہونے سے ہے۔ در اصل شعر کے معنی اور مطالب ایک پورے سلسلۂ خیال سے متعلق ہیں۔ نقش، پیکر، تصویر، کاغذی پیرہن اور شوخیٔ تحریر ان سب کا سلسلہ ایک خاص طرح کے علمی اور ثقافتی ورثہ کے ساتھ ہے۔

شعراء کے یہاں ہمیں یہ التزام ملتا ہے کہ اپنے دیوان کی ترتیب کے وقت اس کا آغاز حمد کی غزل سے کرتے تھے اور اس کے بعد نعت سے متعلق غزل کا اندراج ہوتا تھا۔ بعض شعراء نے اس میں اتنی تبدیلی کی ہے کہ پہلی غزل ہی میں یا اس کے شروع کے ایک دو شعروں میں اس التزام کو کافی سمجھا ہے۔ بارھویں بلکہ تیرھویں صدی تک ہمیں عموماً غزل گوشعرا کے دواوین میں اس طریق کار کے نشان ملتے ہیں۔ غالب کا دیوان بھی اس روایت سے الگ معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ نقش اور مصور کی اصطلاحیں محض مصوری سے متعلق نہیں ہیں۔ اپنی تعبیر کے اعتبار سے

ان کا سلسلہ تصوف کے ساتھ بھی ہے ۔ صوفیاء کے یہاں واردات اور عقائد دونوں کے بیان میں مجازی زبان کا استعمال ہوتا ہے ۔ نقش اور مصور دونوں اپنے ظاہری مطالعہ کے علاوہ ایک داخلی توسیع بھی رکھتے ہیں ۔ غالب جس معاشرتی اور علمی فضاء میں رہتے تھے اس میں بعض مخصوص الفاظ کا استعمال اور ان کے مطالب کے مختلف پہلوؤں کا سلسلہ معاشرتی زندگی کے بعض دوسرے دائروں سے منسلک ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ تصوف کا عملی رخ غالب کے زمانہ تک خاصہ سرد پڑ چکا تھا لیکن یہ وہ سماجی فضا ہے جس میں عمل اور عقیدہ میں تضاد پیدا ہو چکا تھا تاہم جذباتی سطح پر اب بھی اس کے کم و بیش حوالے شعراء کے کلام میں ملتے ہیں ۔ غالب کا نقش فریادی اپنے مفہوم میں نقاشی اور تصوف دونوں سے رشتہ جوڑتا نظر آتا ہے ۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غالب صوفی تھے یا عابد زندہ دار تھے یا نقاش تھے بلکہ کہنے کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ غالب جس فکری اور جذباتی فضا میں رہتے تھے اس کی کڑیاں بہت دور پیچھے تک مذہبی اور ثقافتی روایات سے منسلک ہیں ۔

نقش کا لفظ ادبیات فارسی میں مختلف معنی و مطالب کے لئے مستعمل ہے ۔ نقش سے مراد صورت ، ہیبت و تمکیں ، نقش نغمہ ۔ نقش بیش ۔ نقش زیاد ۔ نقش دیوار نقش باز ۔ نقش ساز ۔ نقش پرداز ۔ نقش طراز ۔ نقش گر ۔ نقش حرام ۔ نقش نشستن ۔ نقش افتادن ۔ نقش داشتن ۔ نقش برگرفتن ۔ نقش ریختن ۔ نقش شکستن ۔ نقش بیجا ۔ نقش جہاں ۔ نقش برآب کشیدن ۔ یہ سارے الفاظ بظاہر نقش کی کرامت ہیں لیکن اپنے مفاہیم و مطالب کے لئے تہذیبی زندگی کے مختلف خد و خال سے تعلق رکھتے ہیں اور جذبات و کیفیات کی متنوع صورتوں کو پیش کرتے ہیں ۔ حیرانی و سراسیمگی ، خوف و ہراس ، اعتبار اور ساکھ بے حاصلی اور بے ثباتی ، تخلیق اور استقرار ، حوصلہ افزائی اور تدبیر ، فتح و کامرانی ، موقع اور محل کی نسبت سے کامیابی عام زندگی کے یہ مختلف پہلو مذکورہ بالا تراکیب میں بخوبی جھلکتے ہیں جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نقش کا لفظ مفاہیم و مطالب کے لئے زندگی کے کتنے وسیع پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۔ مجازی استعمال کی ان روز مرہ صورتوں سے ہٹ کر تخیلی صورتوں کو دیکھیں تو

نقش اور نقاش ، مصور اور مصوری کے لئے مستعمل ہیں - نقش گر سے مراد نقش بند اور مصور ہے - زندگی کے تز ئینی اور آرائشی پہلوؤں کا یہ استعارہ تخلیق سے متعلق بھی ہے - نقش افتادن سے مراد کسی نقش کی تخلیق ، کسی چیز کی شبیہ بنانا ، استعداد و صلاحیت کو ابھارنا - نقش ریختن سے مراد کسی چیز کو پیدا کرنا عدم سے کسی چیز کو وجود میں لانا -

مطلب کا یہ سلسلہ اپنی اصطلاحی صورت میں کائنات کی تخلیقی صورتوں کا استعارہ بھی ہے - خدا نے کائنات کو تخلیق کیا - وہ خالق ہے - اس نے کن کہا دنیا وجود میں آ گئی یعنی فیکون - کائنات کا یہ تخلیقی عمل چھوٹے پیمانے پر مصور کے تخلیقی عمل سے مشابہت رکھتا ہے - اس لحاظ سے خدا مصور یا نقاش اور انسان اس کی تخلیق ہے - کائنات بھی اس کی تخلیق ہے - اسی لئے دنیا کو نقش فانی اور موجودات خارجیہ کو صغر کونیہ کی اصطلاح میں صوفیاء نے پہچاننے کی کوشش کی ہے -

یہ اشکال و اجسام حقائق عینیہ کے اجسام ناسوتی ہیں دنیا خدا تعالی کی نقش گری کا ایک نمونہ ہے - انسان بھی اسی کی تخلیق ہے - خدا خالق ہے ، انسان مخلوق ہے - خدا مصور ہے ، انسان تصویر ہے - خدا نقاش ہے ، انسان نقش ہے - نقش کا لفظ تزئین و آرائش کی ایک صورت کو ظاہر کرتا ہے - انسان احسن التقویم ہے یعنی تخلیق کائنات میں سب سے زیادہ اہم چیز - لیکن دنیا آنی و فانی ہے یہ نقش بھی حوادث زمانہ کے ہاتھوں اپنی عارضی زندگی ختم کر کے دنیاوی وجود کے خاتمہ پر منتج ہوتا ہے - ایک طرف تو انسان خدا کی بہترین تخلیق ، دنیا پر اس کا خلیفہ ہے ، موجودات کا وجود اسی کے لئے ہے لیکن دوسری طرف اس کی ہستی نا پائیداری کا لباس پہنے ہوئے ہے -

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

انسان کی زندگی کے یہ دو پہلو شاعر کی توجہ کا خصوصی نقطہ ہیں -

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

لغت نویسوں کے نزدیک کاغذی پیرھن کی ترکیب فانی اور عارضی ھونے کا ایک ثبوت ہے ۔ نقاش کاغذ پر تصویر بناتا ھے ۔ ھر پیکر تصویر کا پیراھن فی الحقیقت کاغذ ھے ۔ مجازی طور پر اس کے فانی ھونے کا اشارہ خود اس کی تخلیق میں چھپا ھوا ھے ۔ ایک طرف تو انسان خدا کی تخلیقی قوتوں کا بہترین نقش ہے ، لیکن یہ نقش فریاد کر رھا ھے ۔ نقش فریادی ھے کسی کی شوخی تحریر کا ۔

یہ نقش خدا تعالی کی شوخی تحریر کا فریادی ھے ۔ خالق کائنات نے انسان جیسی عظیم چیز کو تخلیق کیا لیکن یہ کیا ستم ہے کہ اس کا وجود عارضی ہے ۔ اب اگر نقش اپنے مصور سے فریاد نہ کرے تو کیا کرے خدا تعالیٰ سے براہ راست تخاطب گستاخی ہے ، اس لئے اشارہ و کنایہ سے بات کا ڈھنگ نکالا ہے کہ یہ نقش کسی کی شوخی تحریر کا فریادی ہے ۔ اسی کیفیت کو مولانا روم نے اپنی مثنوی کے پہلے شعر میں دوسرے استعاروں کی مدد سے واضح کیا ہے ۔ انہوں نے مصوری کے بجائے موسیقی کی اصطلاحات کا سہارا لیا ہے ۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ھا شکایت می کند

اس شعر میں وھی مرکزی نکتہ پیش نظر ھے ۔ انسان کو تخلیق کیا گیا وہ شکایت کر رھا ھے ۔ مولانا روم کے نزدیک یہ شکایت اس وجہ سے ہے کہ یہ نغمہ اپنے اصل سے جدا ھو کر فضا میں تیر رھا ہے اسے یہ شکایت ہے کہ میں اپنے اصل سے دور ھو گیا ھوں ۔ وہ دوبارہ اپنے مرکز کی طرف جانے کے لئے گلہ گزاری پر آمادہ ھے ۔ مولانا روم نے سکایت کے مفہوم کو زیادہ قطعی شکل دی ہے ۔ غالب کی تعمیم زیادہ گہرے مطالب کی حامل ھے ۔ یہ نقش محض مصور کا گلہ گزار نہیں ، اس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے ۔ کیا اس شوخی کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جب خدا نے انسان کو تخلیق کیا تو فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا ۔ فرشتوں نے انسان کی تخلیق کا مقصد دریافت کیا تو جواب ملا کہ جو میں جانتا ھوں تم انہیں جانتے ۔ انسان کو اسم

سکھائے گئے اور وہ خدا تعالی کا خلیفہ اور احسن التقویم قرار پایا ہے ۔ اس عظمت کے ساتھ اس نقش کا یہ پہلو کہ وہ عارضی و فانی ہے اپنے اندر شوخی کے کئی پہلو رکھتا ہے ۔ غالب نے محض جدائی کی شکایت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نقش کو کسی کی شوخئی تحریر کا فریادی قرار دے کر ایک نیم ستائشی ، ایک نیم طنزیہ رویہ اختیار کیا ہے ۔ فکر و نظر کے اس در چشمہ کو اقبال نے انہیں استعاروں کی مدد سے یوں بیان کیا ہے ۔

مجھکو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں

ان توضیحات کی روشنی میں اگر ہم غالب کے شعر پر غور کریں تو اس کی ایمائی حیثیت مختلف سمتوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہے ۔ انسان نقاش کی تصویر کی طرح حسین ۔ جاذب ۔ دلکش ، فنکار کے قلم کا بہترین نمونہ ہے لیکن یہ نقش خود اپنے خالق کی شوخئی تحریر کا فریادی ہے ۔ نقاش کی شوخئی تحریر حسن نظر کی سینکڑوں صورتیں ایک ہی نقش میں ابھارتی ہے ۔ مطالب اور مفاہیم کے مختلف پہلو فکر و نظر کی عجوبہ کاری ، تخلیقی قوتوں کے اظہار کے متنوع طریقے نقاش کے کمال فن کا ثبوت ہیں ۔ لیکن یہ خالق یہ نقاش تصویر کا نقشہ کاغذ پر بناتا ہے ۔ کاغذی پیرہن روایتی لحاظ سے فریادی کا لباس ہے ، کاغذی پیرہن کسی چیز کے عارضی اور فانی ہونے کی علامت ہے ۔ اس لحاظ سے نقاش کی شوخئی تحریر خود اپنے اندر فریادی کا ایک پہلو رکھتی ہے ۔ غالب نقاش اور خدا کے درمیان مماثلت کے ایک سے زیادہ رشتے دریافت کرتا ہے اور ان کے بارے میں ایک خاص طرح کا شوخ لب و لہجہ بھی نکلتا ہے جو اردو اور فارسی شاعری کے روایتی لہجہ سے کسی قدر مختلف ہے ۔

لغت نویسوں کے نزدیک کاغذی پیرہن کی ترکیب فانی اور عارضی ہونے کا ایک ثبوت ہے ۔ نقاش کاغذ پر تصویر بناتا ہے ۔ ہر پیکر تصویر کا پیراہن فی الحقیقت کاغذ ہے ۔ مجازی طور پر اس کے فانی ہونے کا اشارہ خود اس کی تخلیق میں چھپا ہوا ہے ۔ ایک طرف تو انسان خدا کی تخلیقی قوتوں کا بہترین نقش ہے ، لیکن یہ نقش فریاد کر رہا ہے ۔ نقش فریادی ہے کسی کی شوخی تحریر کا ۔

یہ نقش خدا تعالی کی شوخی تحریر کا فریادی ہے ۔ خالق کائنات نے انسان جیسی عظیم چیز کو تخلیق کیا لیکن یہ کیا ستم ہے کہ اس کا وجود عارضی ہے ۔ اب اگر نقش اپنے مصور سے فریاد نہ کرے تو کیا کرے خدا تعالیٰ سے براہ راست تخاطب گستاخی ہے ، اس لئے اشارہ و کنایہ سے بات کا ڈھنگ نکالا ہے کہ یہ نقش کسی کی شوخی تحریر کا فریادی ہے ۔ اسی کیفیت کو مولانا روم نے اپنی مثنوی کے پہلے شعر میں دوسرے استعاروں کی مدد سے واضح کیا ہے ۔ انھوں نے مصوری کے بجائے موسیقی کی اصطلاحات کا سہارا لیا ہے ۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

اس شعر میں وہی مرکزی نکتہ پیش نظر ہے ۔ انسان کو تخلیق کیا گیا وہ شکایت کر رہا ہے ۔ مولانا روم کے نزدیک یہ شکایت اس وجہ سے ہے کہ یہ نغمہ اپنے اصل سے جدا ہو کر فضا میں تیر رہا ہے اسے یہ شکایت ہے کہ میں اپنے اصل سے دور ہو گیا ہوں ۔ وہ دوبارہ اپنے مرکز کی طرف جانے کے لئے گلہ گزاری پر آمادہ ہے ۔ مولانا روم نے سکایت کے مفہوم کو زیادہ قطعی شکل دی ہے ۔ غالب کی تعمیم زیادہ گہرے مطالب کی حامل ہے ۔ یہ نقش محض مصور کا گلہ گزار نہیں ، اس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے ۔ کیا اس شوخی کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جب خدا نے انسان کو تخلیق کیا تو فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا ۔ فرشتوں نے انسان کی تخلیق کا مقصد دریافت کیا تو جواب ملا کہ جو میں جانتا ہوں تم انہیں جانتے ۔ انسان کو اسم

سکھائے گئے اور وہ خدا تعالی کا خلیفہ اور احسن التقویم قرار پایا ہے ۔ اس عظمت کے ساتھ اس نقش کا یہ پہلو کہ وہ عارضی و فانی ہے اپنے اندر شوخی کے کئی پہلو رکھتا ہے ۔ غالب نے محض جدائی کی شکایت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نقش کو کسی کی شوخئی تحریر کا فریادی قرار دے کر ایک نیم ستائشی ، ایک نیم طنزیہ رویہ اختیار کیا ہے ۔ فکر و نظر کے اس سر چشمہ کو اقبال نے انہیں استعاروں کی مدد سے یوں بیان کیا ہے ۔

مجھکو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں

ان توضیحات کی روشنی میں اگر ہم غالب کے شعر پر غور کریں تو اس کی ایمائی حیثیت مختلف سمتوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہے ۔ انسان نقاش کی تصویر کی طرح حسین ۔ جاذب ۔ دلکش ، فنکار کے قلم کا بہترین نمونہ ہے لیکن یہ نقش خود اپنے خالق کی شوخئی تحریر کا فریادی ہے ۔ نقاش کی شوخئی تحریر حسن نظر کی سینکڑوں صورتیں ایک ہی نقش میں ابھارتی ہے ۔ مطالب اور مفاہیم کے مختلف پہلو فکر و نظر کی عجوبہ کاری ، تخلیقی قوتوں کے اظہار کے متنوع طریقے نقاش کے کمال فن کا ثبوت ہیں ۔ لیکن یہ خالق یہ نقاش تصویر کا نقشہ کاغذ پر بناتا ہے ۔ کاغذی پیرہن روایتی لحاظ سے فریادی کا لباس ہے ، کاغذی پیرہن کسی چیز کے عارضی اور فانی ہونے کی علامت ہے ۔ اس لحاظ سے نقاش کی شوخئی تحریر خود اپنے اندر فریادی کا ایک پہلو رکھتی ہے ۔ غالب نقاش اور خدا کے درمیان مماثلت کے ایک سے زیادہ رشتے دریافت کرتا ہے اور ان کے بارے میں ایک خاص طرح کا شوخ لب و لہجہ بھی نکلتا ہے جو اردو اور فارسی شاعری کے روایتی لہجہ سے کسی قدر مختلف ہے ۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی
ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی
مسلم یونیورسٹی ۔ علیگڑھ (بھارت)

غالب ، حالی اور اقبال

غالب کے متعلق کہا گیا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے ۔ اردو زبان کے نقادوں میں بعض حضرات اس قول کو صحیح بتاتے ہیں اور بعض غلط ۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ قول ایک حد تک صحیح ہے اور ایک حد تک غلط بھی ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ غالب ایک عہد آفریں شاعر تھے ۔ یعنی انھوں نے اپنے اسلوب بیان ، جدت ادا اور وسعت مضامین و تنوع افکار کے ذریعہ اردو شاعری کو صورت اور معنی کے اعتبار سے بڑی وسعت دی اور اس کو اس قابل بنایا کہ وہ ہر قسم کے مضامین کے لیے ذریعۂ اظہارو ابلاغ بن سکے ۔ غالب سے پہلے اردو شاعری ایک جوئے کم آب تھی لیکن اب وہ ایک بحر ذخّار ہو گئی اور اس بنا پر اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ وہ حالی کی قومی اور ملی شاعری اور اقبال کی فلسفیانہ شاعری کے لیے سنگ بنیاد کا کام دے سکے ۔ پس مذکورہ بالا قول اس حیثیت سے تو بالکل درست ہے کہ غالب نے حالی اور اقبال کی شاعری کے لیے راہ ہموار کی ہے اور غالب قدیم اردو شاعری اور حالی اور اقبال کی شاعری کے درمیان ایک ایسی کڑی ہے جس کے باعث اردو شاعری کی زنجیر ارتقاء کے مختلف حلقے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط رہتے ہیں اور اس میں تسلسل قائم رہتا ہے ۔ لیکن یہ قول اس اعتبار سے صحیح نہیں ہے کہ حالی اور اقبال دونوں اردو شاعری کے مجدّد اور امام ہیں ۔ ان کی شخصیتیں

عہد آفریں ہیں۔ ان کی طبیعت میں اجتہاد اور غایت تفکر و تدبر ہے اور جو لوگ اس قسم کی صلاحیتوں اور ملکات کے مالک ہوتے ہیں انہیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی دنیا خود پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنی تعمیر میں اپنی ہی طبیعت کے علاوہ کسی اور کے ممنون احسان نہیں ہوتے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

غالب کی شاعری کا جمالیاتی پہلو

غالب ایک عظیم شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری میں انسانی زندگی کے جذباتی معاملات کی بڑی ہی حسین مصوری ہے ۔ ان معاملات کو انہوں نے فکری اور فلسفیانہ لیکن انسانی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے ۔ ان کے یہاں فلسفیانہ خیالات زندگی سے الگ نہیں ہیں ۔ انہوں نے مابعد الطبعیاتی، اخلاقی اور جمالیاتی معاملات کے اسرار و رموز کی بڑی خوبی سے نقاب کشائی کی ہے لیکن ان سب کو زندگی سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے ۔ ان کی فکر ماورائی نہیں ہے ۔ وہ آس پاس اور گرد و پیش کی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہے ۔ وہ انسان کی عظمت کے قائل ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود ان کے خیال میں وہ مجبور محض ہے اور اس کو کائنات کی کسی چیز پر کوئی اختیار حاصل نہیں ۔ وہ محبت اور اخوت کے علمبردار ہیں ۔ وہ موحد ہیں اور ترک رسوم ان کا مسلک ہے ۔ ملتوں کے مٹ جانے کو وہ اجزائے ایمان سمجھتے ہیں ان کے پاس انسانی زندگی کے اجتماعی پہلو کا گہرا شعور موجود ہے اور انہوں نے اپنی شاعری میں اس کے نشیب و فراز کی حقیقت سے بھرپور تصویر کشی کی ہے ۔ ان تمام پہلوؤں نے مل کر ان کی شاعری کو عظیم بنایا ہے لیکن ان پہلوؤں کو حسین اور دل آویز بنا کر پیش کرنے میں بھی وہ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں اور اس صورت حال نے بھی ان کی شاعری کو عظمت سے ہمکنار کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔

اس کا بنیادی سبب تو یہ ہے کہ غالب کے یہاں ہر شاعرانہ خیال نے ایک تجربے کی صورت اختیار کی ہے ۔ وہ محض قافیہ پیمائی کی پیداوار نہیں ہے ۔ اسمیں آورد کا شائبہ تک نہیں ہوتا ۔ اسی لئے اس میں ان کی پوری شخصیت کسی نہ کسی زاویے سے اپنی جھلک دکھاتی ہے ۔ یہ شخصیت بڑی پہلو دار ہے ۔ اس میں بڑی ہی رنگینی اور پرکاری ہے ۔ اس میں روایات کا رنگ رچا ہوا ہے ۔ ماحول کے اثرات

بھی آس پر گہرے ہیں ۔ ان کی شخصیت کی یہ خصوصیات ان کے شاعرانہ تجربات میں بھی نمایاں نظر آتی ہیں ۔ غالب پر فارسی کا اثر بہت گہرا ہے ۔ وہ فارسی کی روایات میں پوری طرح رنگے ہوئے ہیں ۔ یہ فارسی ہی کی روایات کا اثر ہے کہ ان کی شاعری میں جگہ جگہ گل کاریاں سی ملتی ہیں ۔ فارسی کے مزاج کو انھوں نے اردو کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ اس میں بڑی ہی شاداب اور شگفتہ سی فضا پیدا ہو گئی ہے ۔ ان کی شاعری میں ہر جگہ بڑی جگمگاہٹ کا احساس ہوتا ہے ۔ بڑی ہی تابندگی نظر آتی ہے ۔ فارسی کی جو ان گنت ترکیبیں انہوں نے تراشی ہیں ان کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جھاڑ فانوس سے روشن ہیں یا جگہ جگہ پھلجڑیاں سی چھوٹ رہی ہیں ۔ بات یہ ہے کہ ان کی تراشی ہوئی فارسی کی یہ ان گنت ترکیبیں محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہیں ۔ ان میں اس رنگین و پرکار تہذیب کا لہو ہے جس نے غالب کو پیدا کیا تھا اور جس کی رنگینی و پرکاری ان کے ایک ایک انداز سے پھوٹی پڑتی ہے ۔

یہ حقیقت ہے کہ شاعری میں ابہام کا رنگ خاصا گہرا ہے ۔ لیکن اس کا سبب صرف ان کی مشکل پسندی نہیں ہے ۔ یہ رنگ تو ان کے تجربے کی تہہ در تہہ کیفیت کو ظاہر کرتا ہے ۔ اس میں تو ان کے فکر کی گہرائی اپنے آپ کو رونما کرتی ہے ۔ بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ بیدل کے اثر سے انہوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ایسے اشعار زیادہ کہے جن میں ابہام کا پہلو نمایاں ہے ۔ اس میں کسی حد تک صداقت ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غالب نے اس ابہام کو پیدا کرنے میں صرف تقلید سے کام لیا ہے ۔ دراصل یہ ان کا مزاج ہے اور اس کا منبع ان کے احساس کی شدت، جذبے کی پرپیچ کیفیت، ان کے شعور کی گہرائی اور فکر کی بلند پروازی ہے ۔ بیدل کا اثر اس حد تک تو اس میں ہے کہ اس کی انسان دوستی کے نظریے سے متاثر ہو کر وہ انسان کی عظمت اور کائنات میں اس کی حیثیت پر غور و فکر کرنے لگے ہیں اور جب انہوں نے اس کا شاعرانہ اظہار کیا ہے تو ان کے یہاں ابہام کی خصوصیت نمایاں ہو گئی ہے ۔ لیکن اس صورت نے جمالیاتی اعتبار سے ان کی شاعری میں بڑی دلکشی پیدا کی ہے ۔ کیونکہ اس ابہام کو انھوں نے اپنے حدود میں رکھا ہے ۔ اس کی حدیں اشاریت سے ملی ہوئی ہیں،

اور ان کا یہ ابہام درحقیقت اشاریت ھی کا دوسرا روپ ھے ۔ غالب چونکہ بہت کچھ کہنا چاھتے ھیں اسی لئے انہوں نے اپنی باتیں اشاروں اور کنایوں میں کہی ھیں اور اس طرح بہت کم کہہ کر بہت کچھ مراد لیا ھے ۔ انہوں نے مشاھدۂ حق کی بادۂ و ساغر میں اور ناز و غمزہ کی گفتگو دشنہ و خنجر میں کی ھے ۔ اور اس انداز نے ان کی شاعری میں حسن و جمال کا ایک نیا عالم پیدا کر دیا ھے ۔

غالب علامتوں اور اشاروں کے شاعر ھیں ۔ انہوں نے روایتی علامتوں اور اشاروں سے بڑا کام لیا ھے اور ان کو استعمال کرکے اپنی شاعری میں بڑی مانوس سی فضا پیدا کی ہے ۔ انہوں نے گل، بلبل، قفس، آشیانہ، صیاد، گلچیں، شمع، پروانہ، محفل، صحرا، جنوں، باغباں، گل فروش اور اس طرح کی بیشمار علامتیں استعمال کی ھیں اور ان کے ذریعہ سے اپنے شاعرانہ تجربے کے نشیب و فراز کو واضح کیا ھے، اور اس طرح ان کے یہاں بڑی حسین اور دل‌آویز سی فضا پیدا ھوتی ھے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو صرف انہیں علامتوں اور اشاروں تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ بعض نئی علامتوں اور اشاروں کی داغ بیل بھی ڈالی ھے ۔ ان کے یہاں سحر، رات، زنجیر، آگ، دھواں، شعلہ شرر اور اس قسم کی بیشمار علامتیں ملتی ھیں ۔ ان اشاروں اور علامتوں کے ذریعے ان کی معنویت اپنے آپ کو اس طرح ظاھر کرتی ھے کہ اس میں حسن وجمال کی اقدار بھی رونما ھو جاتی ھیں ۔ ان کا اثر براہ راست حواس پر ھوتا ھے اور یہ احساس جمال اور ذوق حسن کی تسکین کا سامان فراھم کرتی ھیں ۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب ظرف تنگنائے غزل کے شکوہ سنج تھے اور اپنے بیان کے لئے کچھ اور وسعتوں کی تمنا رکھتے تھے ۔ یہ وسعتیں ان کے لئے رمزیت اور ایمائیت نے فراھم کیں ۔ غالب کی شاعری میں اس رمز و ایما کی فراوانی نظر آتی ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ھے کہ وہ غزل کے مزاج سے واقف ھیں اور اس کے جمالیاتی پہلو کا صحیح شعور رکھتے ھیں ۔ اس لئے انہوں نے غزل کے رمزوایماء کو بڑے سلیقے سے برتا ھے ۔ اس کام میں علامتوں، اشاروں اور تلمیحوں نے ان کی بڑی مدد کی ھے لیکن اس رمزیت اور ایمائیت کو انہوں نے اپنی شاعری میں صرف اسی طرح پیدا نہیں کیا ہے بلکہ کہیں ایک مخصوص لہجے نے اس کی تشکیل کی ھے، کہیں ایک مخصوص انداز بیان نے اس کا ھیولا تیار کیا ہے، کہیں بعض خاص تیوروں نے اس

کی عمارت تعمیر کی ہے اور اس طرح اس رمزیت اور ایمائیت نے ان کی شاعری میں جمالیاتی پہلو کو ابھارا ہے۔

غالب کی شاعری اپنی ایک شگفتہ اور شاداب فضا سے پہچانی جاتی ہے۔ وہ غزل کے شاعر ہیں اور انھوں نے غزل کی شاعری کے بنیادی مقتضیات کو پورا کیا ہے غزل کی ایک اہم خصوصیت سوز و گداز بھی ہے۔ غالب کے یہاں غزل کا یہ سوز و گداز بھی موجود ہے لیکن اس سوز و گداز کے ساتھ ساتھ انھوں نے انسانی زندگی کے انشاطیہ پہلو کو نمایاں کرکے اپنی شاعری میں بڑی شگفتگی اور شادابی پیدا کی ہے۔ شوخی اور ظرافت، طنز اور مزاح نے شگفتگی اور شادابی کے اس رنگ کو کچھ اور بھی گہرا کر دیا ہے۔ غالب زندگی کی مسرتوں کے شاعر ہیں اور ان مسرتوں سے متعلق مختلف پہلوؤں کی ترجمانی وہ بڑی خوبی سے کرتے ہیں۔ اس ترجمانی ہی کا یہ اثر ہے کہ ان کی شاعری میں جگہ جگہ رنگ و بو کے فوارے سے چھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور حد نظر تک چاندنی سی چٹکی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ غالب ایک رنگین اور پرکار تہذیب کے علمبردار ہیں۔ وہ اس تہذیب کی جمالیاتی اقدار کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ انہیں ان اقدار کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب کی تمام رنگینی اور پرکاری سمٹ کر ان کی شاعری میں آ گئی ہے۔ اس تہذیب کی جمالیاتی اقدار کا عکس ان کی شاعری کے آئینے میں دکھائی دیتا ہے۔ غالب کے مزاج میں ایک حساس مزاج بھی موجود تھا۔ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر دل کھول کر ہنس سکتے تھے۔ انہیں ناسازگار حالات کا مذاق اڑانا بھی آتا ہے۔ اسلئے، ان کے یہاں رونے اور منہ بسورنے کے بجائے مسکرانے اور ہنسنے کی فضا خاصی نمایاں نظر آتی ہے اور اس فضا نے بھی ان کی شاعری میں شگفتگی اور شادابی کے رنگ کو نمایاں کیا ہے۔ غالب اس فضا کے بڑے ہی چابک دست مصور ہیں۔

یوسف جمال انصاری ۔

غمگین، غالب اور فلسفہ رشک[1]

غالب اور غمگین کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالنے کا مقصد یہ ہے کہ اہل فکر کی نظر غالب کی شاعری کے اس رخ پر بھی پڑ سکے جس کا تعلق تصوف کے ساتھ ہے۔ ہمارے زمانے میں نئے نقادوں نے تنقید کا ایک انوکھا ڈھنگ نکالا ہے ۔ جس شاعر کے کلام پر تبصرہ کرنا منظور ہوا اسے پہلے تو بانس پر چڑھایا اور دعویٰ کیا کہ ممدوح ایسا تھا اور ویسا تھا ۔ یہ تھا اور وہ تھا اور سب کچھ تھا ۔ پھر اس کے لتے لینے شروع کئے کہ اس میں یہ کمی تھی وہ خرابی تھی اور وہ برائی تھی ۔ یہاں تک کہ آخر میں یہ ثابت کر دکھایا کہ ۔

منش کردہ ام رستم پہلواں وگرنہ یلے بود در سیستاں

نتیجہ اس کا یہ نکلتا ہے کہ تعریف کے قابل اگر کوئی ذات ہے تو نقاد کی ہے ورنہ شاعر غریب کی حقیقت ہی کیا ہے ۔ غالب جیسا عظیم شاعر و مفکر نقادوں کی دست درازیوں سے محفوظ نہیں ہے ۔ اوپر اوپر ٹیپ ٹاپ اور سچ پوچھو تو غالب نہ صوفی ہے نہ مفکر، نہ فارسی زباں کا مزاج داں نہ اردو پر کامل قدرت رکھنے والا اشعار اس کے مہمل ، زبان اس کی غلط ۔ بس ذرا تحقیق کرنے کی دیر ہے ، ورنہ کیا غالب اور کیا اس کی شاعری ۔ اس تحقیق کے دور میں ہر صاحب قلم بڑے سے بڑے شاعر سے بھی بڑا ہے ۔ غالب کی عظمت کا راز یہ ہے کہ دوسرے شعراء کو گرانا ہو تو انہیں غالب سے جا لڑایا ۔ غالب کی عظمت بذات خود کچھ بھی نہیں ہے سوائے اس کے کہ کلام غالب بعیدالفہم ہے اور مہمل گوئی کے اس دور

۱- وحدت کالونی گورنمنٹ انٹر کالج کی بزم ادب نے مارچ ۶۸ء میں یوم غالب منایا تو راقم الحروف نے اس مقالے کا ابتدائی حصہ پڑھ کر سنایا جس کا تعلق غمگین کے ساتھ ہے ۔ کالج میگزین کے "غالب نمبر" کے لئے پورا مقالہ پیش کیا جا رہا ہے ۔

میں بعیدالفہم ہونا ہی کسی شاعر کا کمال قرار دیا جا سکتا ہے ۔ سب سے بڑا فائدہ اس کا یہ ہے کہ کلام غالب کو امرت دھارا کے طور پر جا و بیجا استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ ایسے نامہ نگاروں کی بھی کمی نہیں جو غالب کو خط لکھتے ہیں اور عالم بالا سے غالب انکے خطوط کا جواب انکی مرضی کے مطابق دینے پر مجبور ہیں ۔ راقم الحروف نئی تنقید سے بے بہرہ، اور غالب شناسوں کے زمرے سے بے تعلق ، کلام غالب کا ایک ادنیٰ متعلم ہے ۔ اشعار غالب میں تصوف کی چاشنی پائی تو جی چاہا کہ اس مسئلے پر معلومات حاصل کرنی چاہئے ۔ میری نو عمری کا زمانہ گوالیار میں گذرا ہے ۔ شاہ غمگین کے خاندان سے واقفیت کا شرف مجھے حاصل رہا ہے ۔ غالب و غمگین کے تعلقات کا علم مجھکو نہ تھا ۔ یہ بات مجھے ۱۹۶۰ء کے قریب معلوم ہوئی ۔ تگ و دو میں لگا رہا ، یہاں تک کہ غالب و غمگین کے خطوط نظر سے گذرے ۔ اس سے میرے اس خیال کی تصدیق ہوئی کہ غالب کو حقیقی طور پر تصوف سے مناسبت تھی ، اور غمگین اس سلسلے میں مرشد کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

غمگین اور ان کی شاعری

سید علی نام ۔ غمگین تخلص ۔ دھلی کے رہنے والے تھے ۔ ان کا سلسلہ امام حسن اور امام حسین سے ملتا ہے ۔ دھلی کے مشائخ میں انکا شمار ہوتا ہے ۔ ۱۷۵۳ء مطابق ۱۱۶۷ھ میں بمقام دھلی پیدا ہوے ۔ وفات گوالیار میں ہوئی ۔ سال وفات ۱۸۵۱ء مطابق ۱۲۶۸ھ ہے ۔ سعادت یار خان رنگین دھلوی سے اصلاح لی ۔ ۱۸۲۰ء یا اسکے لگ بھگ ترک وطن کر کے گوالیار میں جا بسے ۔ انکا مزار گوالیار کے پہاڑی قلعے کے دامن میں ہے جہاں اب بھی ہر سال انکا عرس ماہ صفر کی دوسری تاریخ کو ہوتا ہے ۔ گوالیار میں ان کے نام پر شاہ غمگیں اکیڈمی قائم ہے ۔ انکا خاندان صاحب ثروت ہے ۔ انکے جانشین

حضرت جی کہلاتے ہیں۱ - غمگین جب گوالیار پہنچے تو مہاراجہ نے انکو ہاتھوں ہاتھ لیا - آنکھوں پر بٹھایا اور دل میں جگہ دی ، اور خدا نما حضرت جی کے لقب سے نوزا - چنانچہ گوالیار میں یہ ، خدا نما حضرت جی سید علی غمگین شاہ کہلائے -

غالب اور غمگین کی خط و کتابت برسوں قائم رہی - غالب کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں بھی پیش نظر رہنی لازم ہیں - غالب ۱۷۹۷ء مطابق ۱۲۱۲ھ بمقام اکبر آباد (آ گرہ) پیدا ہوئے - دھلی میں وفات پائی - سال وفات ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۵ھ ھے - غرض کہ غمگین غالب سے چوالیس (۴۴) سال بڑے تھے - اس سے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ غالب غمگین کو مخاطب کرتے وقت انکے رتبے کو اسقدر بلند کیوں کرتے ہیں اور اپنے کو ان سے کمتر کیوں ظاہر کرتے ہیں - چوالیس (۴۴) سال کا فرق کوئی چھوٹا موٹا فرق نہیں ہے - نصف صدی کا حصہ ھے - غمگین نے کوئی سو (۱۰۰) سال کی عمر پائی - غالب سے ۱۸ برس پہلے اس دار فانی سے رحلت کی - اسے بھی خدا کی رحمت سمجھئے کہ ھنگامۂ ۱۸۵۷ء نہ دیکھنا پڑا جس مں اسلامی حکومت کا چراغ گل ہونا لکھا تھا- چنانچہ غمگبن کو غالب کی طرح خون کے آنسو نہیں رونے پڑے - غالب کے نزدیک غمگین ایک بزرگ شاعر ہی نہ تھے ایک سچے صوفی بھی تھے - یہ بات بھی قابل لحاظ ھے کہ غالب و غمگین کی باھمی مراسلت میں غالب ایک سائل بن کر مسائل تصوف پر رہنمائی چاہتے ہیں اور غمگین انہیں معرفت کے نکات سمجھاتے تھے - اب تک جو خطوط منظر عام پر آئے ہیں ان میں گیارہ خط غالب کے تھے اور پانچ خط غمگین کے - اس تناسب سے بھی غالب کی نگاہ میں غمگین کے رتبے کا تعین ہو سکتا ہے -

---

۱ - غمگین کے سجادہ نشین آجکل شاہ رضا محمد حضرت جی ہیں جنکا شمار گوالیار کے سرداروں میں ہوتا ہے - ان کی ذات فی‌الوقت مغتنمات میں سے ہے - شعر و ادب کے شیدا اور اھل کمال کے قدردان ہیں - غمگین اکیڈمی کے بانی ہیں -

لیکن یاد رہے کہ غالب کے جملہ خطوط مختصر ہیں اور غمگین کے مبسوط ، اسلئے کہ غمگین کے خط مسائل تصوف کی تشریح و تفسیر کرتے ہیں ۔

شاہ غمگین ایک سانے ہوئے صوفی تھے ۔ انکی زندگی رشد و ہدایت کے لئے مخصوص تھی انکے خوشہ چیں ، مرید ، اور ماننے والے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے اور انکا نام ایران ، افغانستان اور ترکستان تک مشہور تھا ۔ تشنہ کاموں کی تسکین کے لئے ایک فیض عام جاری تھا ۔ دور دور سے لوگ زیارت کے لئے آتے تھے ۔ خط و کتابت کے لئے دو محرر مقرر تھے ۔ جنکا یہی کام تھا کہ حضرت جی اپنے نامہ نگاروں کو جو تلقین و رہنمائی کرنا چاہتے وہ ان محرروں کے ذریعے لکھوا دیتے ۔ یہ ہر روز کا معمول تھا کہ کئی گھنٹے خط لکھوانے پر صرف کرتے ۔ ان حالات کی روشنی میں یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ غالب نے غمگین کے ساتھ مبالغہ آمیز عقیدت کا اظہار کیوں کیا ۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ خود غالب کو مسائل و معاملات تصوف سے کتنا گہرا لگاؤ تھا ۔

غمگین اپنے زمانے کے جانے پہچانے شاعر بھی تھے ۔ جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے ، وہ رنگین کے شاگرد تھے ۔ مگر اتنا ہی نہیں اسکے علاوہ بھی انکی شاعری کے متعلق کہا جا سکتا ہے ۔ غالب کے خسر نواب الٰہی بخش معروف ، بقول مولوی محمد حسین آزاد ، صاحب آب حیات ، غمگین کے شاگرد تھے ۔ بطور شاعر غمگین کو خواجہ میر درد اور مرزا غالب کی درمیانی کڑی قرار دینا چاہئے ۔ درد بھی غمگین کی طرح ایک صوفی شاعر تھے ، بلکہ شاعرانہ مرتبے کے لحاظ سے غمگین سے بلند تر ۔ غمگین نے درد کی آنکھیں دیکھی تھیں ۔ اور درد کے مشاعروں میں شریک ہوئے تھے ۔ صوفیانہ مشاغل کے باوجود غمگین ایک کثیرالکلام شاعر تھے ، اگرچہ انکے کلام کا بیشتر حصہ اشاعت پذیر نہیں ہو سکا ۔ غمگین کا ایک دیوان ''مخزن الاسرار'' کے نام سے ۱۹٦٦ء میں شاہ رضا محمد حضرت جی نے غمگین اکیڈیمی گوالیار کی طرفسے شائع کیا ہے ۔

”مخزن الاسرار،، میں ۷۹۷ غزلیات اور چند رباعیات ہیں ”مخزن‌الاسرار،، کی زبان آج کی اردو نہیں ، اب سے سوا سو (۱۲۵) برس پہلے کی اردو ہے ۔ یہ دیوان ۱۲۵۳ھ یعنی ۱۸۳۷ء میں مرتب ہوا تھا ۔ اگرچہ اب زبان اور محاورے میں وقت کے ساتھ تبدیلیاں آ چکی ہیں ، کلام غمگیں سے لطف اٹھانا اب بھی ممکن ہے ۔ متاخرین نے غمگین کی تعریف جی کھول کر کی ہے ۔ شیخ ابراہیم ذوق نے ان کو استاد کہہ کر پکارا ہے ۔ شیفتہ ، میر قدرت اللہ قاسم ، عبدالغفور نساخ ، خوب چند ذکا ، اور رنگین نے ان کا تذکرہ احترام سے کیا ہے[۱] ۔ رنگ شاعری کے اعتبار سے غمگین ، میر تقی میر اور خواجہ میر درد کے معاصر نظر آتے ہیں ، جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہوگا ۔

وہ پلا مے کہ مجھ میں اور تجھ میں
نہ رہے کچھ حجاب اے ساقی

یاد میں اس کی فراموش ہوا ہوں ایسا
کہ مجھے شکل بھی اس شوخ کی اب یاد نہیں

مکھڑے کو اس کے دیکھ کے مطلق رہا نہ ضبط
منہہ سے نکل گیا ہی کہ کیا جانے کیا ہے تو

میرے تو درد کا نہ ہوا تجھ سے کچھ علاج
کیا جانے کس کے درد کی قاتل دوا ہے تو

غمگیں میں رشک ورنج سے بیمار ہو گیا
غیروں کے اسکو درپئے آزار دیکھ کر

۱۔ غمگین کی شخصیت اور شاعری پر ہندوستان میں کام ہو رہا ہے ۔ ملاحظہ ہوں:- ”مطالعہ حضرت غمگین،، انجمن ترقی اُردو علیگڑھ ۱۹۶۳ء ۔ ”شاہ غمگین حضرت جی اور انکا کلام،، ادارہ فروغ اُردو ۔ لکھنو ۱۹۶۳ء ۔ ”انتخاب مخزن‌الاسرار،، نسیم بک ڈپو ۔ لکھنو ۱۹۶۶ء ۔ رسائل و جرائد میں بھی شاہ غمگین پر لکھا جا رہا ہے ۔

کوئی اس بت کو کیوں کر بھول جائے　　　خدا دیکھے سے جس کے یاد آئے

اگر کامل کوئی دیکھے ، ترا دیوانہ ہو جائے
جو مجنوں دیکھ لے تو عاقل فرزانہ ہو جائے

صرف مجھکو عشق تیرا چاہئے
عشق ہو تیرا تو پھر کیا چاہئے

یار بے پردہ ہے روز و شب مگر
دیکھنے کو چشم بینا چاہئے

جسکے بن دیکھے ہے یہ حالت مری
دیکھئے پر کیا ہو، دیکھا چاہئے

وصل کی بھی آرزو غمگین نہ ہو
یعنی عاشق بے تمنا چاہئے

یہ بات بھی یاد رہے کہ "مخزن الاسرار" (۱۸۳۷ء) غمگین کا دوسرا دیوان ہے۔ دیوان اول انھوں نے اپنے استاد رنگین کے رنگ میں اب سے ۱۷۰ برس سے بھی پہلے ۱۷۹۵ء مطابق ۱۲۱۵ھ میں مرتب کیا تھا۔ یہ دیوان ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ غمگین کے کمال شاعرانہ کا نمونہ دراصل ان کی رباعیات کا مجموعہ "مکاشفات الاسرار" ہے۔ جس میں ۱۸۰۰ اٹھارہ سو رباعیات ہیں۔ اصل دیوان انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے جسے ہندوستان کا پہلا وائسرائے لارڈ کیننگ ملکہ وکٹوریہ کے لئے دہلی کے شاہی کتب خانہ سے لے گیا تھا۔ "مکاشفات الاسرار" ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ غمگین نے یہ دیوان رباعیات مرزا غالب کے لئے تیار کیا تھا اور غالب ہی کے نام معنون بھی کیا۔ غالب نے اپنے آٹھویں خط میں اس دیوان کی بیحد تعریف کی ہے۔ شعر کے معاملے میں غالب رو رعایت کے قائل نہ تھے۔ ان کی تعریف سند کا درجہ رکھتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ آپ کا کلام قدسی میرے لئے

سرمۂ سلیمانی ہے ۔ اردو جیسی سرمدی زبان کے لیے ایسا کلام باعث فخر ہے ۔ ” مکاشفات الاسرار ،، میں اس قسم کی رباعیات درج ہیں ۔

عارف کوئی پوچھے کس کو کہتے ہیں بتا
تو کہہ کہ جو کچھ نہ جانتا ہو بخدا
جو پوچھے کہ کیا ہے معرفت اے غمگین
تو کہہ کہ لہو شناخت اپنے کے سوا

” مکاشفات الاسرار ،، تمام تر رموز تصوف سے متعلق ہے ۔ اول تو ۱۸۰۰ رباعیات کہنا اور پھر ہر رباعی میں ایک نہ ایک نکتہ رکھنا ایک ایسا کمال ہے جسکا جواب نہیں نظر آتا ۔

عین اور غیر کا مسئلہ ۔

” مکاشفات الاسرار ،، کا نسخہ تیار کر کے غمگین نے اسے اپنے قاصد خاص کے ہاتھ گوالیار سے غالب کے پاس دہلی بھیجا اور تاکید کی کہ غیروں کی نظر سے ان رباعیات کو مخفی رکھا جائے ۔ غالب نے جواب دیا کہ مخفی رکھنا کیا ضرور ہے ۔ جو نہیں جانتے ان سے مخفی رکھنا اس لئے بیکار ہے کہ وہ جانتے ہی نہیں ۔ جو جانتے ہیں ان سے مخفی رکھنا محض بے سود ہوگا کہ وہ پہلے ہی جانتے ہیں ۔ اور پھر سو (۱۰۰) باتوں کی ایک بات یہ کہ یہاں کون ہے جسے غیر کہتے ہیں اور کون ہے جو عین کہلا سکتا ہے ۔ حق ہی حق ہے ۔ اس سلسلے میں غالب نے اپنے خط میں خود اپنا ہی شعر نقل کر دیا ۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجنا محال ہے

اورینٹل کالج میگزین ۱۹۶۳ء میں غمگین و غالب کے خطوط شائع ہو چکے ہیں ، اگرچہ طباعت ناقص ہے اور اغلاط کا ٹھکانہ نہیں ۔ جی چاہتا تھا کہ چند ٹکڑے ان خطوط کے پیش کرتا ۔ افسوس کہ یہ زمانہ فارسی دانی کا نہیں اور غالب و غمگین کی تمام تر خط و کتابت فارسی ہی میں ہوئی ہے ناچار مجھے خاموشی اختیار کرنی پڑ رہی ہے ۔ بہر حال ناظرین کو غالب کے مندرجہ بالا شعر کے سیاق و سباق سے یہ اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ انھوں نے ایک پیچیدہ اور علامتی طرز سخن کس لئے ایجاد کیا ۔ یعنی اس لئے کہ وہ بات بھی کہہ سکیں اور انکی بات صرف موزوں اشخاص تک پہنچے جو بات سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں دوسرے لوگ یعنی جو بات سمجھ ہی نہ سکتے ہوں ان سے غالب کو کوئی خطرہ نہ تھا ۔ جب اخفائے حال ہی مقصود ہو تو اس کے لئے خاموشی ضروری نہیں ۔ ایک پیچیدہ اور علامتی رنگ کلام وہی کام کرے گا جو خاموشی کر سکتی ہے ، چنانچہ غالب کے طرز شاعری کو مہمل کہنے والے در اصل وہ ہیں جن سے غالب رموز و نکات معرفت پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں ۔

عین و غیر کی بحث نے غمگین و غالب کے خطوط میں خاصا طول کھینچا ہے ۔ غالب کو وحدت الوجود کے مسئلے سے گہری دلچسپی تھی ۔ یہ بات انکے دل کو نہ لگتی تھی کہ عین عین ہے اور غیر غیر ۔ کائنات ایک ہی وجود کی مختلف شکلوں کا مجموعہ ہے تو اس میں عین و غیر کو تسلیم کرنا ایک قسم کی ثنویت کے مترادف ہوگا ۔ جیسے ایرانی مذہب کے پیرو یزدان و اہرمن ، خیر و شر ، نور و ظلمت کو دو (۲) حقیقتیں مانتے ہیں ۔ زرتشت اور مانی نے اس قسم کی تلقینات کی ہیں ۔ غمگین نے غالب کے شبہات کو رفع کر دیا ۔ غمگین کی رباعی ملاحظہ ہو ۔

اس ایک وجود میں یہ کیا کیا ہے سیر

زاہد ہے حرم ہے اور غمگین ، ہے دیر

اسماء و صفات ہیں یہ فہمائش کے
کہنے سے عین ہو نہ کہنے سے غیر

یعنی تمام کپڑے روئی ہی سے بنتے ہیں خواہ چادر ہو یا عمامہ لیکن کوئی چادر کو عمامہ نہیں کہے گا ۔ یہی صورت عین اور غیر کی ہے ۔ عین اور غیر دونوں خدا کے نام ہیں ۔ اسمائے الٰہی بیش از شمار ہیں ۔ وہ رحیم بھی ہے ۔ اور منتقم بھی ۔ یعنی ایک ہی ذات میں عین اور غیر دونوں شامل ہیں ۔

غمگین و غالب کی خط و کتابت میں عین و غیر ، وحدت وجود اور شغل بے رنگی کو خاص اہمیت حاصل ھے ۔ غالب شغل بے رنگی کے عادی تھے ۔ یہ ایک خاص صوفیانہ مشغلہ ہے ، ایک روحانی ریاضت اور عارفانہ مشق ھے ۔ صوفیاء صبح سویرے سورج سے آنکھ لڑاتے ہیں ۔ وہ فضا میں نظر جماتے ہیں اور اس حد تک جماتے ہیں کہ توجہ زمین و آسمان ، اپنی ذات اور غیروں کی ذات ، سب سے ہٹ جاتی ہے ۔ اس مشق سے حیرت اور اس کے بعد فنا کا مقام حاصل ہوتا ھے ۔ بے رنگی کے نظارے میں غالب کو جو لطف حاصل ہوتا تھا اس کا تذکرہ انہوں نے اپنے مرشد روحانی یعنی غمگین شاہ سے کیا ۔ حضرت جی نے جواباً لکھا کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں ۔ ایک صوفیانہ شغل ہے جس سے یہ بھی ممکن ہے کہ حیرت محمود کی بجائے حیوت مذموم پیدا ہو ۔ بہر حال ان خطوط کی روشنی میں ایک بات صاف سمجھ میں آتی ھے ۔ وہ یہ کہ اب تک غالب کے بارے میں یہ غلط سمجھا جاتا رہا ھے کہ تصوف سے انکا ربط محض علمی تھا یعنی فلسفۂ تصوف بذریعہ اکتساب انہوں نے حاصل کیا تھا اور صوفیانہ افکار انکے کلام میں روایت غزل کے طور پر پائے جاتے ہیں ۔ حقیقت حال اس کے برعکس ہے ممکن ھے یہاں یہ اعتراض کیا جائے کہ غالب جیسا دنیا دار اور عقل پرست بھلا صوفی کیونکر ہو سکتا ھے مگر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اسلامی تصوف میں ترک دنیا پر وہ زور نہیں دیا جاتا جو مسیحت اور ویدانیت اور بدھ مت جیسے رہبانی مذاہب میں دیا جاتا ھے ۔ اسلامی تصوف

میں دھر اور وقت یا زمانہ خدا کی ایک شان ہے اور کائنات جلوۂ خداوندی سے معمور ہے البتہ مقصد حیات یہ ہے کہ رضائے الٰہی حاصل کی جائے ۔

فلسفۂ رشک اور غالب ۔

اول تو رشک کی کارفرمائی شخصیت میں انانیت کی پہچان ہے اور غالب کی انانیت ایک مسلمہ حقیقت ہے ۔ جس شخص میں انانیت کی بہتات ہو وہ مبتلائے رشک ضرور ہوگا ۔ وہ اسی تصور میں غرق رھیگا کہ دنیا اسکے لئے غیر ہے اور اس سے دشمنی پر تلی ہوئی ہے ۔ یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے مگر اسکا سمجھنا چنداں دشوار نہیں ۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ غمگین نے رشک کے گہرے مطالعہ سے غالب کو آشنا کر دیا اسکا اعتراف غالب نے غمگین کے نام ایک خط میں کیا ہے ۔ لکھتے ہیں کہ اب اصل معاملہ میری سمجھ میں آ گیا ۔ میں غلطی پر تھا کہ عین و غیر میں تفریق نہ کرتا تھا ۔ غمگین نے غالب پر ایک نیا باب فکر کھول دیا ۔ کہنے کو حکیم مومن خاں مومن دھلوی نے بھی مضامین رشک نرالے انداز میں باندھے ہیں لیکن مومن کو وھابیت کے طفیل وہ معرفت حاصل نہ ہو سکتی تھی جو غمگین کے ذریعے غالب کو ہوئی ۔ غزل ایک مثلث ہے جسکے تین کردار ہیں ۔ شاعر ، محبوب اور رقیب یعنی غیر ۔ لیکن یہ غیریت روایت غزل سے پیدا ہوئی ہے ۔ غالب نے غیر کے مفہوم کو رقیب تک نہیں رکھا ہے ۔ غیریت انسان کی ذات میں موجود ہے ۔

نے مژدہ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ایسے شاعر کے لئے اس قسم کے مضامین رشک پیش پا افتادہ ہیں ۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ھمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

بعض اوقات مرزا کو اپنی ذات سے رشک آتا ہے ۔ عرفان ذات کی یہ بھی ایک منزل ہے کہ اپنی ہی ذات میں وہ عین کو بھی دیکھ لے اور غیر کو بھی ۔ غرض کہ غالب نے مضامین رشک طرح طرح سے باندھے ہیں اور یہ سب بڑی حد تک غمگین کا عطیہ ہے ۔ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر غمگین کو فراموش نہ کرنا چاہئے ، جن سے غالب نے بہت کچھ حاصل کیا تھا ۔

یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجئے
یا پردۂ تبسم پنہاں اٹھائیے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوف بد آموزیٔ عدو کیا ہے

ڈاکٹر رانا م ۔ ن احسان الٰہی

اسداللہ خان غالب اور قنوطیت

(عزیزم جاوید احمد خان کی فرمائش پر ان عزیزان وطن کی
خاطر جو غالب کے افکار پر قلم اٹھانا چاہتے ہیں میں نے
یہ چند نکات بطور راہنمائی کے سپرد قرطاس کیے ہیں)

ہر ادب کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سخنور کے تخیل اور اس کے اسلوب بیان پر اس کا ماحول کسی نہ کسی حد تک ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ اسداللہ خان غالب کا بھی یہی حال ہے ۔

غالب کے دیوان (اردو) پر سرسری نگاہ ڈالنے سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ غالب کی شاعری میں کہیں تصوف کا رنگ نمایاں ہے اور کہیں فلسفے کی پیچیدگیاں اس کے کلام میں دقت پیدا کر رہی ہیں ۔ ساتھ ہی ساتھ ایک ہلکی سی جھلک قنوطیت (Pessimism) کی بھی پائی جاتی ہے ۔

معروف ہے کہ غالب کو عمر بھر سکھ اور چین نصیب نہیں ہوا ۔ طفولیت ہی میں والدین کے سایہ شفقت سے محروم ہو گئے اور پھر کچھ مدت کے بعد چچا بھی چل بسے ۔ ننھیال والوں نے پرورش کی ۔ ابھی ابھرے بھی نہ تھے کہ ازدواجی بندھن میں جکڑ دیے گئے ۔ مشکلات اور تنگیوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ آمدن محدود تھی ۔ پریشان ہو گئے ۔ انھوں نے پرانے وظیفہ کے اجرا کے لیے درخواست گزاری مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی ۔ اسی اثنا میں ان کا بھائی محمد یوسف اختلال دماغ کا شکار ہوا ۔ غالب کی ذہنی کوفتیں دو چند ہو گئیں ۔ کہتے ہیں کہ انھیں ایام میں ان کی محبوبہ جنھیں وہ متاع حیات تصور کرتے تھے داغ مفارقت دے گئی ۔ گویا غالب کے دل پر یہ سب سے بڑی چوٹ تھی ۔

ادھر مغلوں کی بساط سلطنت لپیٹ کر رکھ دی گئی - ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں گوروں نے بہیمانہ انداز سے لوگوں کا قتل عام کیا اور دھلی اور اس کے نواح کو تاخت کیا - شعر و سخن کے حلقے منتشر ہو گئے - ادبی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں - خود غالب کو بھی جیل کی ہوا کھانی پڑی - بھائی مر گیا - پھر ان کا اپنا بیٹا عارف بھی دنیا فانی سے رخصت ہو گیا - ان کے لیے ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۹ء تک کے دو سال سخت ابتلا کے دن تھے - قلیل سا وظیفہ جو زندگی کا واحد سہارا تھا بند ہو گیا -

درون خانہ یہ حال تھا کہ وہاں بھی راحت میسر نہ آئی - چھ سات بچے ہوئے مگر کوئی بھی نہ بچا - ع

بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

اور ستم بالائے ستم کہ اس نابغۂ روزگار کو مربی کو در کنار کوئی غم خوار بھی نہیں ملا ، بلکہ کسی سخن فہم اور قدر شناس نے حوصلہ افزائی بھی نہیں کی - غالب چلا اٹھے :

زندگی اپنی جب اس طور سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ایک اور مقام پر یوں کہا ہے :

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہو

مگر وہ متقی اور خدا ترس تھے - رنج و الم اور یاس کے عالم میں بھی ان کی زبان سے کلمہ کفر نہیں نکلا - البتہ ان کے شعر میں قنوطیت کی میلان نظر آتا ہے - ان کی نگاہ ہر معاملے میں تاریک پہلو پر پڑتی ہے - ہر نیک و خوب کو بھی وہ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں - شاید سمجھتے ہیں کہ اس دنیا میں "شر" ہر گاہ "خیر" پر غالب رہے گا -

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

ایسا ہی تصور یوں بھی پیش کیا ہے :

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اور انتہا یہ ہے کہ

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

شیکسپئر کے ہاں بھی ہمیں یہ معنی ملتا ہے :

To die,—to sleep ;—
To sleep ! perchance to dream ;--ay, there's the rub ;
For that sleep of death what dreams may come,
When we have shuffled off this mortal coil,
Must give as pause.

بہار زر نگار کی مثال لیجیے - دنیا کے ہر شاعر نے فصیل گل کو فطرت کا جمیل ترین تحفہ کہا ہے - مگر غالب کی آنکھ میں یہ خار بن کر چبھتی رہی - چنانچہ

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی مدام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

غالب کی زندگی کے حالات پر قلم اٹھانے والوں نے لطائف و ظرائف کا ایک معقول ذخیرہ جمع کرایا ہے ایسے احوال پڑھنے سے ہمیں یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ غالب کی طبیعت میں مزاح اور شگفتگی بدرجہ اتم موجود تھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جگہ بہ جگہ چٹکلے سناتے پھرتے ہیں اور اپنے احباب کی محفلوں کو زعفران زار بناتے چلے جاتے ہیں - یہ سب کچھ درست - مگر تنہائی میں ہٹ کر غالب سے پوچھیے کہ اس مجموعہ اضدار چہ معنی دارد - جواب یہ ہے

سوزش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

شاید وہ آلام پیہم سے خوگر ہو گئے :

رنج سے خو گر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اور وہ بے حس ہو گئے : ع

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا

غالب نے ہر رنج اور ہر دکھ کو اپنے ہی لیے سمجھ لیا ۔

نام کا ہے مرے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

غالب کا فلسفۂ غم کیا ہے ۔ ان کے نزدیک حیات و غم متجانس و متقارن ہیں بلکہ لازم و ملزوم ہیں۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اسی طرح : ع

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج

موت علاج تو ہے مگر یہاں بھی محرومئی قسمت آڑے آتی ہے :

کس سے محرومئی قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے ۔ بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن بہر حال غالب ہمیں خوش نظر نہیں آتے ۔ وہ کہتے ہیں :

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے
کل اسد کو ہم نے دیکھا گوشۂ مے خانہ میں
دست بر سر سر بزانوئے دل مایوس تھا

اور آخر میں : ع

ہزار آفت و یک جان بے نوائے اسد

پروفیسر حافظ منظورالحق عثمانی

غالب کی شخصیت کا ایک اہم پہلو

کسی نقاد کا قول ھے کہ مغلوں کے دور حکومت نے ہندوستان کو تین تحفے دیئے ۔ تاج محل، اردو اور غالب۔۔۔ یہ درست ہے کہ غالب کی شاعری کے پیچھے وہ تمام ثقافتی ورثہ موجود ھے جسے مغلوں کے دور نے جنم دیا ۔ مگر غالب اردو اور تاج محل دونوں سے بہت زیادہ مختلف ھیں ۔ وہ ایک فنکار ھیں جو عام انسانوں سے کہیں زیادہ باشعور اور حساس ھوتا ہے ۔ عظیم فنکار ثقافتی ورثہ نہیں ھوتے نئی ثقافت کو جنم دیتے اور ورثہ میں چھوڑتے ھیں ۔ غالب نے روایت سے بغاوت کی ھے اور نئی روایت کو جنم دیا ہے ۔ انہوں نے جو ثقافت ورثہ میں چھوڑی ہے اس کی تشکیل میں ان کا بھی اتنا ھی حصہ ھے جتنا مغلوں کے دور حکومت کا۔

کسی عظیم فنکار کو سمجھنے کیلئے اسکی شخصیت کو سمجھنا ضروری ھوتا ہے ۔ فن اصل میں فنکار کی شخصیت ھی کا عکس ھوتا ھے اسلئے یہ ممکن نہیں ھے کہ فنکار کی شخصیت کو نظر انداز کر کے فن کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکے ۔ غالب کی شاعری میں انکی شخصیت کا ایسا بھرپور اظہار ہے کہ اسے نظر انداز کرکے انکی شاعری کو سمجھنا ممکن نہیں وہ اپنی شاعری میں ھر پہلو سے سامنے آتے ھیں مگر انکی شخصیت کا جو پہلو بار بار ھمارے سامنے آتا ھے یہاں ھم اسی کو زیر بحث لائینگے غالب کی شخصیت کے اس پہلو کو ''جذبہ افتخار،، یا ''انانیت،، کہا جا سکتا ھے یہ انکی انانیت ھی تھی جس نے انھیں روش عام سے بچ کر چلنے پر مجبور کیا انہوں نے شعر و ادب کی مسلمہ روایات کو توڑا اور اردو غزل کو ترقی کی نئی راھوں سے روشناس کیا ۔

شخصیت کی تعمیر میں جو عوامل خاص طور پر حصہ لیتے ھیں ۔ ان میں ماحول، خاندان، تعلیم و تربیت اور فطری صلاحتیں شامل ھیں ۔ مرزا کی شخصیت پر سب سے

زیادہ جو چیز اثر انداز ہوئی وہ انکا احساس محرومی ہے ۔ وہ ایک عظیم خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کے اسلاف کے کارنامے اور مراتب یقیناً ایسے تھے جن پر مرزا فخر کر سکتے تھے مگر جب وہ اپنی طرف دیکھتے تھے تو نہ وہ دولت تھی نہ وہ مراتب، نہ وہ عزت نہ اقتدار ۔ وہ بساط ہی الٹ چکی تھی جس کی بدولت انکے بزرگوں نے اعزاز حاصل کئے تھے ۔ مرزا کے لئے لے دے کر بزرگوں کے کارناموں اور اقتدار و اعزاز پر فخر کرنا ہی رہ گیا تھا ۔ مگر ,,پدرم سلطان بود،، کہنے والا اگر خود کچھ نہ ہو تو بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے مرزا جیسا آدمی اپنے آپ کو ہدف تضحیک نہیں بنا سکتا تھا اس لئے جب انہوں نے دیکھا کہ جوہر تیغ دکھانے کا زمانہ گذر گیا تو انہوں نے اپنے لئے ایک نئے میدان کا انتخاب کیا اور تلوار کے بجائے قلم کے جوہر دکھائے ۔ اور قلمرو شعر کو اس طرح تسخیر کیا کہ جب تک اردو زبان باقی ہے انکا سکہ چلتا رہیگا ۔ انکا میدان مختلف سہی مگر انہوں نے اپنے بزرگوں سے کہیں زیادہ عزت و شہرت پائی ۔

مرزا غالب اپنے حسب و نسب پر ہمیشہ فخر کرتے رہے خاندانی اعزازات کو حاصل کرنے کیلئے آخری وقت تک کوشاں رہے ۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو رئیس زادہ سمجھا ۔ ظاہر ہے وہ اپنے تمام حسب و نسب کے باوجود رئیس یا والئی ریاست نہ تھے ۔ وہ درمیانی طبقہ کے ایک عام آدمی تھے اور انکے وسائل ایسے ہی تھے جیسے اس طبقہ کے ایک عام آدمی کے ہوتے ہیں مگر مشکل یہ تھی کہ وہ اس تلخ حقیقت کو جاننے کے باوجود ماننے کیلئے تیار نہ تھے ۔ وہ ہر طرح سے رئیس زادگی کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے ۔ مالی اعتبار سے وہ عوام سے ممتاز نہ ہو سکتے تھے اسلئے انہوں نے خود کو ممتاز کرنے کے لئے روش عام سے بچ کر چلنا سیکھا ۔ وہ لباس، وضع قطع حتیٰ کہ مرنے تک میں خود کو ممتاز رکھنا چاہتے تھے ۔ انکا وبائے عام میں مرنا نہ چاہنا فقط مزاحیہ فقرہ نہیں ہے بلکہ یہ ان کی طبیعت کے ایک خاص رجحان کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ رجحان ہے ان کی انانیت ۔ ان کی طبیعت کے اسی رجحان نے انہیں ایک عظیم شاعر بنا دیا ۔ اس رجحان نے انہیں شعر و ادب کی مسلمہ روایتوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا ۔ ان کے ہم عصر شعراء اور اہل قلم نے بہت کچھ مخالفت کی مگر وہ ,,گر نہیں ہیں

مرے اشعار میں معنی نہ سہی،، کہہ کر وہی کچھ کرتے رہے جسے وہ خود پسند کرتے تھے ۔ ان کی انانیت سپر ڈالنے کو تیار نہ تھی ۔ وہ ترک تھے اور ان کے آباؑ و اجداد میدان چھوڑنے کے قائل نہ تھے وہ بھی انھی کے نقش قدم پر چلے اور حریفوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ۔ ان کے بزرگوں نے اپنی تلوار کا لوہا منوایا تھا مرزا نے قلم کا لوہا منوایا ۔

غزل انتہائی روایتی صنف شاعری ہے قافیہ اور ردیف کی قید کے علاوہ اس پر مضامین، زبان اور طرز بیان تک کی پابندیاں ہیں ۔ غالب نے جب یہ کہا کہ

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

تو یہ مبالغہ نہیں اظہار حقیقت تھا، غالب بہت بڑے فنکار تھے اور کوئی بھی بڑا فنکار روایت کی زنجیریں پہننا گوارا نہیں کیا کرتا ۔ عظیم فنکار روایت کا غلام نہیں اس کا خالق ہوتا ہے ۔ غالب نے غزل کو نئی روایت، نئی زبان اور نیا اظہار بیان دیا ۔ ان کی انانیت نے یہ گوارا نہ کیا کہ پا مال راستوں پر چل کر اپنی امتیازی شان کو بٹہ لگائیں اس لئے انہوں نے اپنی غزل کے لئے نئے راستے کا تعین کیا ۔ لوگ کہتے رہے ,,مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے،، مگر وہ کسی کی پرواہ کئے بغیر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے

ہوں گرمئی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

وہ جانتے تھے کہ

شہرت بشعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

یہ ضروری نہیں کہ عظیم فنکار اپنی عظمت سے بھی با خبر ہو ۔ مگر غالب ایک ایسے فنکار تھے جو اپنی عظمت کا پورا احساس اور شعور رکھتے تھے انھیں معلوم تھا کہ ,,غالب کا ہے انداز بیاں اور،، انہیں پوری طرح احساس تھا کہ انہوں نے ,,تنگنائے غزل،، کو ,,بقدر شوق،، وسعت دینے میں کامیابی حاصل کر لی ہے ۔ انکا یہ

دعوئ مبالغہ یا تعلی پر مبنی نہیں ہے کہ ۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے غزل جیسی روایتی صنف سخن کو روایت کی زنجیروں سے اس طرح آزادا کیا کہ وہ ان کے عظیم افکار کی ترجمان بن گئی ۔ انہوں نے غزل میں ایسی وسعت پیدا کی کہ دلیا کی کسی اور صنف سخن میں اس سے زیادہ بلکہ اس کے برابر وسعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ غالب کی غزل نے اردو غزل کے مطالعہ کے لئے نئے ابواب کھولے اور غزل کے نقادوں کو نئے اصول تنقید فراہم کئے ۔ انہوں نے غزل کو وہ توانائی بخشی کہ اب غزل ہر دور میں اپنا لوہا منواتی رہے گی ۔ گردش زمانہ غزل کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی ۔ غالب نے غزل میں ہر دور کا ساتھ دینے کی صلاحیت پیدا کی ۔ اس کا رابطہ براہ راست زلدگی سے قائم کیا اب یہ ایک زندہ اور ترقی پذیر صنف سخن ہے جس کی ترقی کے امکانات لا محدود ہیں ۔ غزل کے ان ہی لا محدود امکانات نے اقبال کی شاعری کو جنم دیا ۔

غالب کی انانیت انہیں قدم قدم پر روایت شکنی پر اکساتی ہے وہ نہ صرف تخیل اور طرز ادا میں اپنی علیحدہ راہ اختنار کرتے ہیں بلکہ غزل کے فنی لوازم کے معاملہ میں بھی جدت پسندی سے کام لیتے ہیں ۔ آلام زمانہ انہیں سپر ڈالنے پر مجبور نہیں کرتے ۔ روایتی عاشقوں کی طرح وہ وفاداری اور جاں سپاری کے قائل نہیں ۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

- - - -

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

عشق و وفا، محبوب پر جان نثار کرنا وغیرہ اردو غزل کے روایتی مضامین ہیں مگر غالب کے ایسے اشعار بھی روایتی نہیں ہوتے جو انہی مخصوص موضوعات سے متعلق ہوں ۔ ان کی خود پسندی انہیں قیس و لیلیٰ اور شیریں فرہاد جیسے روایتی

عاشقوں پر پھبتی کسنے پر مجبور کرتی ہے

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ‌کن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

وہ خضر و سکندر، منصور، کوہ طور، موسیٰ ابن مریم غرض کہ غزل کے تمام روایتی اشخاص اور موضوعات پر طبع آزمائی کرنے کے باوجود اپنی روش برقرار رکھتے ہیں اور اپنی انانیت کو کہیں ترک نہیں کرتے وہ ہر چیز کو نئے زاویہ سے دیکھتے ہیں ۔

غالب کی شاعرانہ قدر و قیمت کا تعین ہو چکا ہے ۔ وہ دنیا کے عظیم شعرا کی صف اول کے شاعر ہیں ہمارا مقصد یہاں ان کے کمالات اور عظمت کا جائزہ لینا نہیں ہے بلکہ ان کی عظیم شخصیت کے صرف ایک پہلو کی طرف اشارہ کرنا ہے کیونکہ یہ پہلو ان کی شاعری میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے ۔ اسی نے انہیں روایت شکنی اور جدت طرازی پر آمادہ کیا اور اسی نے انہیں اپنی عظمت کا شعور بخشا ۔ اسی انانیت نے انہیں خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رکھا ۔ اسی کی بدولت وہ مخالفتوں اور ناقدر دانیوں سے کبھی نہ گھبرائے انہیں اپنی عظمت کا پورا احساس تھا اسلئے انھوں اپنے معترضین کی کبھی پرواہ نہ کی اور اسی راہ پر رواں رہے جو انہوں نے اپنے لئے متعین کی تھی ۔

در گرم روی سایہ و سر چشمہ نہ جویم
با ما سخن از طوبی و کوثر نہ تواں گفت

اگر غالب میں انانیت کا یہ جذبہ اتنا شدید نہ ہوتا تو عین ممکن تھا کہ لوگوں کی مخالفت سے گھبرا کر وہ اپنی روش چھوڑ دیتے اور ایسی شاعری کرتے جو اس زمانے کے مذاق کے مطابق ہوتی ۔ مگر اس صورت میں غالب غالب نہ ہوتے اور یہ دعویٰ نہ کر سکتے کہ

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن
ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن

غالب خستہ کے بغیر

(صاحب مضمون کا اس مضمون سے متفق ہونا ضروری نہیں)

گھر کی رونق اک ہنگامہ پر موقوف ہو یا نہ ہو شہر کی رونق ضرور ہزار ہنگاموں سے عبارت ہے ۔ آدمی کہ بجائے خود اک محشر خیال ہے ، ہر آن اک نئے تماشہ کی طلب گار ہے ۔ گھر کے اندر نغمۂ شادی ہو کہ نوحۂ غم ، شریک حیات کے شیوۂ تسلم و رضا کا حدود میں پابند ہے یہ نہ ہو تو ہنگامہ فساد بن جائے ۔ نقص امن قریہ قریہ اور شہر شہر ہو تو آدمی تماشہ سمجھ کر لطف اندوز ہو لیتا ہے لیکن اپنے چھوٹے سے مکان میں محض اندیشۂ نقص امن بھی کسی کو گوارا نہیں کہ تماشہ کرنا اور بات ہے ، تماشا بننا اور بات ۔

اس سال شہر کی رونق جن ہنگاموں سے فروزاں تھی وہ فساد بن گئے اور موقوف ہوئے ۔ پتہ نہیں عشاق نے بتوں سے کیا فیض پایا ۔ البتہ غالب صدی کا ہنگامہ کہ شروع سال میں برپا ہوا تھا مگر قبائے خواجہ پردراز دستئی رقیباں کے تماشے اور عشرت گئہ شریں کے لیے پرویز و کوہکن اور کئی دوسرے حضرات کی نبرد آزمائی میں دب گیا تھا ، پھر سے عروج پر ھے ۔

غالب ایک عظیم شاعر ھیں ۔ اس سے مرزا یگانہ کو بھی‌انکار نہیں ۔ اردو شعر کی روایت میں ان کی سیادت بھی مسلم ، جدید ذھن سے ان کی ہم آہنگی بھی بجا ، لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ غالب کی تصویر مرقع چغتائی سے نکل کر ھیر کٹنگ سیلون کی زینت بنے اور غالب نوازی پنسل فروشی تک پہنچے تو غالب کی عظمت معتبر ہو گی ۔

صاحب ، غالب کی وقعت اس کے شعروں سے وابستہ ہے اس کی تشہیر سے نہیں

وہ جو ایسے شعر کہہ سکتا ہے ۔

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

اور مٹتا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کوئی
عمر عزیز وقف عبادت ہی کیوں نہ ہو

اور گھر میں تھا کیا کہ تیرا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

اسے ڈھنڈورے کی کیا ضرورت ؟

غالب نے خدا جانے کیا سوچ کر کہا تھا

زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں وہ کے لئے اب وہ روشناس خلق ہونے کی جزا اور سزا پا رہے ہیں کچھ اس طرح کہ ضرور کہتے ہوں گے رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے ۔

احوال یوں ہے کہ ادھر غالب ہیں جو عیار طبع خریدار دیکھ کر بکنے پر مصر ہیں اورادھر ہزار غالب نواز ہیں کہ کچھ قلم لئے اور کچھ لٹھ لئے اس متاع سخن پر تصرف کے مدعی بنے ہیں ۔ وہ بھی ہیں جو میر کے بعد اب غالب کے حوالے سے خود شناسی کی جستجو میں ہیں اور وہ بھی ہیں جو غالب کے وسیلے سے اپنی تشہیر کا سامان فراہم کر رہے ہیں ۔ کچھ غالب کی سفارش سے حکام کی خشنودی کے طلبگار ہیں ۔ پھر ایک طبقہ سوداگروں کا ہے کہ غالب کے نام سے اپنے کاروبار کو وسیع کرنے اور سود اور ثقافت کے درمیاں رشتہ استوار کرنے کی فکر میں ہے ۔ کہاں تک گنوں ، اس ھجوم میں کہ غالب کے گرد جمع ہے کون نہیں ہے ؟ ۔

غالب نے کہا تھا اور سچ کہا تھا کہ

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

لیکن اب کہ اسے قید حیات اور بند غم دونوں سے نجات پائے سوسال ہونے کو آگے ہیں ، غالب کے بغیر سبھی کام بند ہیں ۔ اخبارات لیجئے غالب کا تذکرہ ہو گا یا فلم کے اداکاروں کا ، غالب کے کارٹون اور تصویریں ہوں گی یا ان حسینوں کی جن کے متعلق غالب زندہ ہوتے تو ضرور پوچھتے یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ؟ اور جس کسی سے پوچھتے وہ ان کی کم علمی پر پہلے تو حیران ہوتا پھر ان عشوہ و غمزہ و ادا والوں کے نام ، ان کے والدین کے پتے ، عشاق کی فہرست اور جسم کے خصوصی اعداد و شمار سناتا اور اس سے پہلے کہ غالب اسے

اے تازہ وار دان بساط ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے
ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بنغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

سنانے کا ارادہ کرتے ، وہ کسی ہسپتال میں زیر علاج کسی اداکارہ کی عیادت کی خواہش کرنے والے لوگوں کی لمبی قطار میں کھڑا ہونے کے لئے چل دیتا ۔ غالب کی خوش بختی ہے کہ اب اس کی تصویر اور تذکرہ پاکستانی فلم کی مونا لیزاوں ، کے پہلو میں ہے ، عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو ۔ شاید یہ بات بھی ہے کہ وہ جو سالہا سال سے عالم اخبار وہ تصاویر میں شریک غالب بلکہ سراسر غالب بے شرکت غیرے تھے اب بزم ناز سے اٹھ چلے ہیں ۔ ورنہ مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام ۔

ادبی اور تقریباً ادبی رسالوں کے لئے تو غالب صدی لحیم و شحیم و ضخیم شمارہ نکالنے کا بڑا معقول جواز ہے اور وہ نامعقول جواز سے فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے ۔ اس موقع کو کیسے ہاتھ سے نکل جانے دیں ۔ تو ہر رسالہ غالب نمبر پر غالب نمبر نکال رہا ہے ۔ کوئی دو سیر کا کوئی ڈھائی سیر کا ۔ ایک رسالہ کے مدیر تو ایسی الجھن میں پڑ گئے کہ دو تین مہینے پریشان رہے ۔ غالب نمبر نکالیں تو مضامین کہاں سے لیں ۔ سارے نقاد مصروف تھے بلکہ اوور ٹائم کام کر رہے تھے نہ نکالیں تو رقیب جینے نہ دیں گے ۔ آخر دیوان غالب سے فال نکالی (یوں غالب کو

حافظ کے مقابل کھڑا کر دیا) ۔ مگر غالب کے لئے یہ فال کا کاروبار نیا تھا ۔ حافظ شیرازی کی طرح مشاق و ماہر نہیں ہوئے تھے ۔ اس لیے کوئی مہمل سا شعر نکلا۔ مدیر صاحب سمجھ گئے کہ غالب نہیں چاہتے کہ وہ غالب نمبر نکالیں ۔ شاید غالب اس لئے ناراض تھے وہ رسالہ کبھی لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا اور غالب کہتے ہیں

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ہوس سیر و تماشہ سو وہ کم ہے ہم کو
اور مقطعٔ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

خیر انہوں نے ارادہ ترک کر دیا لیکن خاص نمبر نکالنے کی عادت کہیں چھٹتی ہے۔ اس لیے پھر سے فال نکالی مگر غالب نے حوصلہ افزائی نہ کی ۔ اب کیا کیا جائے کوئی امید بر نہیں آتی ۔ کیا غضب ہے کہ غالب نمبروں کی نمائش لگے اور اس میں ہمارا رسالہ نہ ہو ۔ کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب ۔ آخر دل مضبوط کرکے پھر دیوان غالب اٹھایا اور آخری دفعہ فال نکالی ۔ اب کے ایک ایسا شعر نکلا جس کی تشریح مدیر صاحب نے یہ کی کہ غالب فرماتے ہیں اب جو آپ نے مجھے تین بار لسان الغیب بنایا ہے تو مجھے اعتبار آیا ۔ آپ کے ذوق و شوق اور خلوص پر میاں یہ کرو کہ تمہارے رسالے میں پچھلے چالیس پچاس سال میں میرے متعلق جو کچھ چھپا ہے یکجا کر کے چھاپ دو ۔ تمہارا غالب نمبر بھی ہے ہاں وہ اصلاحیں جو آپ لوگوں نے میرے اشعار پر دی ہیں وہ نہ چھاپنا__تو یوں ایک اور غالب نمبر شائع ہو گیا ۔

ریڈیو سنئے تو بچوں کے پروگرام سے کمرشل سروس تک غالب ہی غالب ہو گا ۔ قوالی میں بھی غالب ، ٹھمری میں بھی غالب ، دادرے میں بھی غالب ۔ ہر کچے پکے راگ میں غالب ، ادھ کچے ادھ پکے راگ میں غالب اور بالکل کچے پکے راگ میں بھی غالب ۔ فیچروں میں بھی غالب ، ڈراموں میں بھی غالب ، تقریروں میں بھی غالب بلکہ وہ جو فیچر بھی نہیں ڈرامہ بھی نہیں تقریر بھی نہیں سراسر کچھ بھی نہیں اس میں بھی غالب ۔ فرمایشی پروگراموں میں بھی غالب اور تادیبی پروگراموں میں بھی غالب ، کوکا کولا اور صابن ، ڈبل روٹی اور سائیکل کے اشتہارات میں بھی غالب ـــــ ہمارا سائیکل بہترین ہے کیوں‌کہ غالب کا ہے طرز بیاں اور ـــ غالب کو روغنی روٹی پسند تھی لیکن آپ D D T ڈبل روٹی کھائیے ۔ ہمارے بینک

میں حساب کھول کر فکر فردا سے نجات حاصل کیجئے کہ غالب قرض کی مے پیتے تھے یہ اچھی عادت نہیں ۔ آپ اچھے بچے بنئے آج روپیہ بچائیے کل نقد پیجئے ۔

اب رہ گیا ٹیلیویژن تو سنا ہے کہ وہاں بھی غالب پر کسی سٹوڈیو کا دروازہ بند نہیں ۔ 'ایوان شہر، میں غالب 'گر تو برا نہ مانے، میں غالب 'آج کے فنکار، میں غالب 'کل کے فنکار، میں غالب اور کچھ حضرات کہتے ہیں کہ رابن ہڈ اور رابنسن کروسو میں بھی غالب ۔ شوخئی تقریر پروفیسر رالف رسل کی یا جناب افسر رضوی کی موضوع سخن غالب اور کسی بقراطون کی ہو تو نقش فریادی غالب وہی غالب جس نے کہا تھا ۔

بر روے شش جہات در آئینہ باز ہے
یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

غالب کے کچھ اور اشعار بھی سن لیجئے ۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

لیکن ذرا ٹھہریئے اس شعر میں اقبال کا نام کیسے آ گیا ۔ ہمیں ایک غالب شناس نے کل ہی یہ شعر سنایا تھا غالباً غالب سے سہو ہو گیا ۔ اپنے نام کی جگہ اقبال کا نام لکھ گیا یا شاید اس نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ میرے بعد ایک اور شاعر اقبال بھی آئے گا لیکن وہ اپنے آپ سے آگاہ نہیں ہو گا ۔ اسی لیے کچھ نقاد آجکل کہتے ہیں کہ اگر غالب نہ ہوتا تو اقبال بھی نہ ہوتا ۔ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے ۔ اگرچہ سچی بات یہ ہے کہ ان کی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی ۔ آخر غالب کیوں نہ ہوتے اور اگر نہ بھی ہوتے تو اقبال کیوں نہ ہوتے ۔ البتہ اقبال اور غالب دونوں نہ ہوتے تو ان تنقید نگاروں کا کیا بنتا جن کی شہرت اور روزی غالب اور اقبال کے متعلق اس قسم کے مفروضوں سے وابستہ ہے ۔ بہر حال ہمیں اپنی کم علمی کا اعتراف ہے ہو سکتا ہے وہ شعر اقبال کا ہو ۔ آپ کی فراخ حوصلگی سے توقع ہے کہ معاف کر دیں گے ۔ آخر مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے اور عالم فاضل حضرات غالب کی قنوطیت کا ثبوت اس کے شعر ۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

سے لاتے ہیں اور صاحب میرا مبلغ علم کیا نہ پروفیسر ہوں نہ ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ۔

اگر آپ نے معاف کر دیا ہے تو غالب کا دوسرا شعر سن لیجئے ۔

ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

کیا عمدہ شعر ہے آپ ہی کہیے غالب نے جو اپنے متعلق کہا ہے ۔ اس کے بعد اور کہنے کو کیا رہ جاتا ہے ۔ ضد کی بات اور ہے آپ چاہیں تو دیوان غالب کو ہندوستان کی الہامی کتاب کہہ لیں یا غالب سمیت ساری اردو غزل کو غیر مہذب قرار دے دیں ۔ تفنن بر طرف غالب پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں غالب کم ہے اور اس کے مہربان زیادہ ۔ غالب پہ یہ کم زیادتی نہ تھی کہ پہلے وہ اہل مدرسہ کے ہاتھ لگا اور انھوں نے جو شرحیں اس کے اشعار کی لکھیں انھیں دیکھ لیتا تو گھبرا کے مر جاتا ۔ پھر ستم یہ ہوا کہ مطربوں کی سرپرستی میں آیا اور انھوں نے اس کے کلام کی وہ پنکچوایشن کی کہ اچھے بھلے شعروں کے بخیے کھل گئے اور اب تو گویا دریا کا بند ٹوٹ گیا ہے ۔ ایک خلقت ہے کہ غالب شناسی کا عذر رکھ کر غالب پر مشق سخن کر رہی ہے ۔ تصنیف و تالیف کے سلسلے میں ہمیں انگریزوں کی وضع داری پسند ہے کہ پروفیسر صاحب ساری عمر آکسفورڈ میں شیکسپئر پڑھاتے ہیں اور خوب پڑھاتے ہیں ۔ ریٹائر ہونے کو پہنچتے ہیں تو ایک دو سو صفحہ کی مختصر سی کتاب لکھتے ہیں اور بڑی عاجزی سے شائع کرتے ہیں --- اور ادھر یہ عالم ہے کہ ہر وہ آدمی جس نے غالب کا نام سنا ہے غالبیات کا ماہر بنا بیٹھا ہے ۔ بڑے بڑے نقاد ، چھوٹے چھوٹے نقاد ، پرانے پرانے نقاد ، نئے نئے نقاد ، بڑے بڑے پروفیسر ، چھوٹے چھوٹے پروفیسر اور حد یہ کہ میرے جیسے صرف لکچرر جن میں کچھ ہابیل کو قابیل اور قابیل کو ہابیل سمجھتے ہیں سبھی کے سبھی غالب پر لکھ رہے ہیں اور بے تحاشہ لکھ رہے ہیں ۔ ہمارے ایک دوست جو اپنی خوش نصیبی سے نہ اردو لکھ سکتے ہیں نہ انگریزی دوسروں سے لکھوا کر اپنے نام سے چھپوا

رہے ہیں کہ کوئی رقیب کم علمی کا طعنہ نہ دے ۔ ہمیں ان کی غالب سے عقیدت کا احترام ہے ۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ ان سے کس حکیم الملک نے کہا ہے کہ غالب پر مضمون تمہارے نام سے چھپے ہی تو نبض کی رفتار اعتدال پر آئے گی ۔ خیر صاحب وہ مختار ہیں جو چاہیں کریں ہم ٹوکنے والے کون کہ ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے ۔

آپ سے کیا چھپائیں ۔ جب غالب صدی کا غلغلہ ہوا تو ہمیں بھی شوق ہوا کہ کسی نہ کسی طرح غالب شناسوں میں قدم رکھیں ۔ ارادہ کیا کہ غالب پر ایک چھوٹی موٹی کتاب بھی لکھ دیں ۔ کیا عجب دربار بقائے دوام میں جگہ مل جائے یا کم از کم ترقی کے لیے مفید ثابت ہو ۔ اس سے پہلے ہم ایک دو خلاصے اور گائیڈیں لکھ کر تصنیف و تالیف کی مشق فراہم کر چکے تھے چاہا کہ پہلے غالب کے متعلق دو چار کتابیں پڑھ لیں تو کام آسان ہو جائے گا ۔ ایک عزیز کے کہنے پر یادگار غالب پڑھنا شروع کی ۔ اچھی معقول و معتدل کتاب تھی ۔ مگر اتفاق سے ایک پروفیسر صاحب نے ہمارے ہاتھ میں وہ کتاب دیکھ لی ۔ پوچھا میاں کیا پڑھ رہے ہو ۔ غالب اس عہد جدید کا شاعر ہے اور مولانا حالی ماضی بعید کے وضع دار سادہ دل بزرگ ، جو دیکھتے اور سنتے تھے سچ مان لیتے تھے ۔ غالب کی پہلو دار شخصیت ان کی پرہیز گار اور با وضو تحریر میں کیا نمایاں ہوگی ۔ غالب کے لیے تو سٹریچی کا قلم چاہیے ، ذہانت و شرارت چاہیے ۔ یہ قول و فعل سن کر ہم نے یادگار غالب طاق پر رکھی اور محاسن کلام غالب اٹھائی کہ بجنوری کی ذہانت و نطانت کا شہرہ بہت سنا تھا ۔ مگر ہماری کم علمی یا بد نصیبی کہ کتاب جتنی بار پڑھی ، یہ ہی معلوم ہوا کہ محاسن کلام غالب کے نام اور کہیں کہیں ان کے اشعار کے حوالے کے با وصف غالب کے متعلق نہیں بلکہ ڈاکٹر بجنوری کے ادب عالم سے شغف کی داستان ہے ۔

یہاں سے مایوس ہو کر ارادہ کیا کہ منت غیر کیوں اٹھاؤں غالب کو ہی کیوں نہ پڑھوں ۔ ادھر ادھر سے رقم فراہم کرکے دیوان غالب خریدا ، اس کے پہلے صفحہ پر اپنا نام اور اپنی ڈگریوں کی تفصیل لکھی ۔ جلد پر پچھلے مہینے کے

(Playboy) ٹائیٹل کا کور چڑھایا ۔ سگریٹ اور پان مہیا کیے ، دو تین اردو فارسی لغات سامنے رکھیں اور مسلح ہو کر دیوان کا مطالعہ شروع کیا ۔ ابھی نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا والے شعر کی گرفت میں اسیر تھا کہ ایک مہربان حضرت فیضی کہ صحیح معنوں میں پہنچے ہوئے بزرگ ہیں ، آ گئے ۔ ہمیں یوں ادب آداب سے مطالعہ کرتے دیکھ ہنسنے لگے ، دل کھول کے ہنس چکے تو بولے بھائی کس چکر میں پڑے ہو کہ یوں سما دھی لگائے بیٹھے ہو ۔ عرض کیا کہ اس خاکسار کا ارادہ غالب پر ایک کتاب لکھنے کا ہے ۔ اب تو وہ یوں ہنسے کہ میں واقعی پریشان ہو گیا ۔ آخر جب تھک گئے تو بولے ارادہ تو نیک ہے مگر یہ دیوان غالب کیوں پڑھ رہے ہو جل کر عرض کیا تو کیا انسا ئیکلو پیڈیا برٹینکا پڑھوں ۔ فرمایا خیر انسائیکلو پیڈیا تو نہیں

ہڈسن کی .An Introduction to the study of Literature

اور سکاٹ جیمز کی .The Making of Literature

پڑھو ، جتنے حصے کا ترجمہ کر سکو کر لو پھر ہر دسویں سطر پر غالب کا ایک شعر اور ہر دوسرے صفحے پر دو شعر ڈال دو تمہاری کتاب تیار ہے ۔ اب مجھے ہنسی آ گئی ۔ کہا صاحب یہ کیا بات ہوئی ، ہڈسن اور سکاٹ جیمز سے غالب کا واسطہ ۔ وہ بزرگ اب میری جہالت پر متاسف ہوئے اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر گویا ہونے اے خدائے علیم و خبیر اپنے سادہ دل بندوں پر رحم فرما اور انہیں ہدایت دے ۔ دعا کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئے میاں اگر تم میں عقل نہیں ہے تو دوسروں سے سیکھ لینے میں کیا حرج ہے ۔ ارے بھئی بڑے بڑے سکہ بند نقادوں نے اپنی کتابیں اس طریقہ سے ہڈسن جیمز اور ایلیٹ کی مدد سے لکھی ہیں اور صرف غالب پر نہیں ، دنیا بھر کے موضوعات پر لکھی ہیں ۔ ہاں یہ احتیاط کی ہے کہ اپنے Ghost writers کا حوالہ کہیں نہیں دیا ۔ اگر تم نہیں مانتے تو جاؤ ایک مختصر سا رسالہ بکف چراغ دارد یاچہ دلاور است دزدے یا کوئی اسی قسم کا نام ہے دیکھو میری بات کا کچھ نہ کچھ یقین آ ہی جائے گا ۔ عرض کیا صاحب مجھے یقین آیا ۔ انہوں نے کمال مہربانی سے میری جہالت کو معاف کر دیا اور بڑی شفقت سے کہنے لگے ۔ عزیزم ہمیں تو تمہاری بھلائی مقصود ہے بہر حال صبح کا بھولا شام کو گھر

آ جائے تو یہ بھی اس کی سعادت مندی ہے ۔ ایک بات اور سن لو ۔ اگر دیوان غالب پڑھو گے تو اکثر اشعار تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے اور جو آئیں گے وہ اس بری طرح تمہارے ذہن پر چھا جائیں گے کہ ساری عمر انہیں پڑھتے رہو گے اور سر دھنتے رہو گے کتاب لکھنے کی نہ فرصت ملے گی نہ ضرورت محسوس ہوگی ۔ هڈسن اور جیمز سے اگر تمہارے تعلقات اچھے نہیں تو غالب کے شار حین اور ناقدین کو پڑھ لو ۔ کبھی هنسی آئے گی کبھی غصہ آئے گا اور کبھی رونا آئے گا ۔ اس هنسی غصہ اور رونے دھونے میں کتاب نہیں تو دو چار مضمون لکھ ہی لوگے ۔ پھر کتاب لکھنا کیا ضرور ہے ۔ غالب کے حوالے سے شعیہ سنی فساد کیوں نہیں کرا دیتے ۔

اس وقت تک هم هڈسن کی کتاب کے چار ابواب کا ترجمہ کر چکے هیں اور حسب ضرورت غالب کے اشعار بھی منتخب کر لیے هیں ۔ اب ایک پبلشر کی تلاش ہے جو هماری کتاب شایع کرنے کا بیڑا اٹھائے ۔ اس سلسلے میں ایک ناشر سے گفتگو هوئی ۔ اس نے سب سے پہلے یہ سوال کیا صاحب یہ فرمائیے کہ آپ ایم اے اردو کے کتنے پرچوں کے هیڈ ایگزامینر هیں اور کتنے پرچے آپ نے بنائے هیں ۔ پوچھا اس بات کا میری کتاب کی اشاعت سے تعلق ؟ وہ مرد دانا میرے مہرباں دوست کی طرح هنسنے لگا ۔ حضرت میں کتابیں ضرور چھاپتا هوں مگر بیچنے کے لیے ۔ اور اگر آپ هیڈ ایگزامینر هیں نہ پیپر سیٹر تو ۔

اب هم اس کوشش میں کہ کسی نہ کسی طرح پیپر سیٹر بن لیں تو کتاب شایع هونے کا انتظام هو ۔ رکاوٹ صرف یہ ہے کہ هم اردو میں ایم اے نہیں ۔ خیر خدا نے چاھا اور همارے دوست کے مشورے شامل حال رہے تو PH D. بھی کر لیں گے ۔ پھر کتاب بھی شایع هوگی اور وہ حضرات جو آج هماری غالب فہمی پر نکتہ چین هیں ۔ غالب ڈے پر هم سے پیغام کی فرمایش کریں گے اور سو سو طرح خوشامد کریں گے ۔

مرزا غالب کی آردو نثر

مرزا اسد اللہ خان غالب کو جدید اردو نثر کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ھے اور کہا جاتا ہے کہ مرزا غالب جدید اردو نثر کے موسس اعلی اور بانی مبانی تھے ۔ اگر مرزا غالب سے جدید اردو نثر کا آغاز ہوتا ھے تو یہ بات واضح ھو جاتی ھے کہ مرزا غالب سے قبل کی اردو نثر قدیم نثر ہے ۔ اب سوال یہ پیدا ھوتا ھے کہ اگر وہ قدیم نثر ھے تو اس کی قدامت کی وجوہات کیا ھیں ؟ اور موجودہ نثر میں وہ کیا خصوصیات اور محاسن ھیں جو اس کے سر پر جدت کا تاج رکھا گیا ہے ۔؟

بادی النظر میں اگر دیکھا جائے تو یوں معلوم ھوتا ہے کہ جو نثر اردو زبان کے ابتدائی دور میں مروج تھی اسے قدیم کے لقب سے نوازا گیا اور جو موجودہ زمانے میں رائج ہے اسے جدید کا خطاب دیا گیا ۔ اگرچہ یہ بات بھی کسی حد تک درست ہے لیکن یہ ھمارے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ۔ لہذا حقیقت کچھ اس کے علاوہ ہے جو اردو نثر کی تاریخ کا جائزہ لینے سے ھمارے سامنے آئے گی ۔

السنۂ جہاں کی تواریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں نظم کا ظہور پہلے ہوا اور نثر بعد میں وجود میں آئی ۔ ایسا کیوں ہے ؟ یہ ایک طویل بحث ہے جس کا ھمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں لہذا صرف Andrew Lang کے ایک حوالے پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ وہ Encoclopaedia Britannica میں لکھتا ہے ۔

"Poetry is far older than writing. It has now been established that the folk songs of the world peoples, still repeated and sung by peasants in out of the way villages are an immemorial inheritance"

تاہم ہماری اردو زبان بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ۔ ہمارے ہاں بھی یونان کی Ilaid اور Odyessey جرمن کی Nibelungenlied انگریزی کی Cunterbury Tales کی مانند اردو ادب کا باقاعدہ آغاز نظم سے ہوا اور اردو نثر آٹھویں صدی ہجری میں ظہور پذیر ہوئی ۔ اس کے ابتدائی نمونے چھوٹے چھوٹے تبلیغی رسالوں کی صورت میں ملتے ہیں ۔ اس ضمن میں شیخ عین‌الدین گنج‌العلم کے رسالے سب سے قدیم خیال کیے جاتے ہیں ۔ جن میں مذہب اسلام کے علماء کبار ، صوفیا اکرام کے مشہور اقوال ، امثال اور احادیث قلمبند ہیں ۔ شیخ موصوف کا انتقال ۷۹۵ھ میں ہوا ۔ لیکن ان کے رسائل میں سے اس وقت ایک بھی رسالہ دستیاب نہیں ۔ اس لیے ان کی نثر اور اسلوب کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ البتہ خواجہ بندہ نواز حضرت سید محمد گیسو دراز کی ایک تصنیف 'معراج‌العاشقین' کے نام سے شائع ہوئی ہے ۔ خواجہ موصوف نے ۸۲۵ھ میں رحلت فرمائی یقیناً یہ کتاب ۸۲۵ھ سے پہلے لکھی گئی ۔ اس کتاب کا موضوع بھی مذہب اسلام کی تبلیغ و اشاعت ہے ۔ عبارت کا مختصر نمونہ ملاحظہ فرمائیے

"ایک بادشاہ کی تعظیم ایک امیر نوں بڑی کرتا ہے ۔ تو اول جا جا آرائش کرتا ہے ۔ سو محمد کو رنجہ تن سنوار کر سات آسمان کے اوپر لائے اور پھر عروج نے لے کر چالے ۔ ناسوت کی منزل سوں"

اس عبارت کو ایک نظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جملوں کی ترتیب میں گرائمر کا قطعاً لحاظ نہیں رکھا گیا ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اردو زبان کی گرائمر اس تصنیف کے بعد مرتب کی گئی تھی ۔ دوسرے بعض نامانوس الفاظ اس میں استعمال کیے گئے ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں ۔

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے بعد بہت سے بزرگ مثلاً سید محمد عبداللہ الحسینی اور میراں جی شاہ شمس العشاق برہان‌الدین جانم ۔ امین‌الدین اعلیٰ گذرے ہیں

جنہوں نے بے شمار مذہبی رسالے اور کتابیں لکھی ہیں اور جن سب کا ایک ہی موضوع تبلیغ اسلام اور رشد و ہدایت ہے ۔

لیکن ان سب رسائل سے قطع نظر اردو نثر میں سب سے پہلی کتاب جس سے داستانی ادب کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے وہ ملا وجہی کی "سب رس" ہے ۔ یہ کتاب ۱۶۳۵ء میں تصنیف ہوئی ۔ سلطان عبداللہ شاہ قطب کی فرمائش پر سب رس فارسی سے اردو زبان میں منتقل کی گئی ۔ مصنف نے ایک عالمگیر حقیقت کو مجازی انداز میں پیش کیا ہے قصہ بھی عجیب و غریب ہے اور اسلوب نگارش بھی اچھوتا ہے ۔ کتاب میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو ۔

عقل بغیر دل کوں نور نہیں ۔ عقل کو خدا کہنا بھی کچھ دور نہیں ۔ ذات نے صفات ہے ۔ ذات تے جو کچھ نکلیا هووے بے ذات ہے ۔ جوں رفتار ہور ۔ اس کا نور کیوں هووے مشہور ۔

اس اقتباس میں اگرچہ فقروں کی بندش پہلے سے کہیں بہتر نظر آتی ہے تاہم نامانوس الفاظ کا استعمال بدستور ہے الفاظ کے استعمال میں بے قاعدگی ہے ۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث کا قطعاً لحاظ نہیں ہے اور سب سے اہم بات اس نثر میں یہ ہے کہ قافیہ پیمائی کا التزام رکھا گیا ہے ۔ مصنف شعوری طور پر اس سعی میں ہے کہ ہم قافیہ الفاظ کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرے اور نثر کو پر تکلف بنائے ایسی نثر اگرچہ پڑھنے میں بے حد مزہ دیتی ہے مگر گوہر معنی الفاظ کی الجھنوں میں گم ہو جاتا ہے لہذا جہاں یہ نثر زبان کو لذت عطا کرتی ہے وہاں مطالب و مقصود سے تہی دامن ہوتی ہے ۔

سب رس کی اشاعت کے بعد ۱۷۳۵ء میں جو کتاب ہمیں سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ افضل علی فضلی کی "دہ مجلس" ہے جو ملا واعظ حسین کاشفی کی تصنیف "روضۃ الشہداء" کا آزاد ترجمہ ہے ۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو ۔

"پھر دل سے گذرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیے ۔ کامل مدد کس طرف

رسالہ کاروان ۱۹۳۳ء مضمون از حافظ محمود شیرانی ۔

سون هووے شامل - کیونکہ بے تائید حمیدی اور بے مدد جناب احمدی یہ مشکل صورت پذیر نہ هووے اور گوهر مراد رشتہٴ امید میں لہ اوے،،

ده مجلس کا انداز نگارش مشکل اور دقیق ہے اور اس میں فارسی اور عربی زبانوں کے الفاظ کی خاصی بھرمار ہے - حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں فارسی اور عربی زبانوں کا هماری زبان اردو پر بے حد اثر تھا - - - - - اور علماء فارسی اور عربی میں لکھنا باعث فخر جانتے تھے اور اردو کو در خور اعتناء سمجھتے تھے - اس اعتبار سے فضلی کا اجتہاد قابل ستائش ہے -

ده مجلس کے بعد اگرچہ بہت سی کتابیں اردو نثر میں لکھی گئیں مگر ان سب کا انداز نگارش ده مجلس کی تقلید تھا - اور کوئی خاص قابل ذکر بات ان میں نہیں تھی - ان میں سے بیشتر کے موضوعات بھی مذهبی اور اخلاقی تھے - تاهم جس کتاب نے سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ میر محمد عطا حسین خان کی ”نو طرز مرصع،، ہے - یہ دراصل محمد علی معصوم کے قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے - جو غالباً ۱۷۷۵ء میں منصہ شہود پر آیا - یہاں اس امر کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ تحقیق و جستجو سے ثابت هوچکا ہے کہ قصہ چہار درویش (فارسی) کے اصل مصنف میاں محمد علی معصوم تھے اور امیر خسرو سے اس کی کوئی مناسبت نہیں -

۴ مئی ۱۸۰۰ء میں جب کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم هوا اور اسکے پہلے پرنسپل ڈاکٹر جان گلکرسٹ مقرر هوئے تو کالج کے نصاب کیلئے بہت سی کتب اردو نثر میں لکھوائی گئیں جن میں سے میرا من کی باغ و بہار ، حیدر بخش کی آرائیش محفل، خلیل علی خان اشک کی امیر حمزه، بہادر علی حسینی کی نثر بے نظیر، اور نیم چند کھتری کی گل صنوبر کو بے حد شہرت نصیب هوئی - مگر یہ سب کتابیں داستانیں هیں - جن میں بادشاهوں، شہزادوں، تاجروں، ساحروں، جنوں، بھوتوں، پریوں، اور پری زادوں کی طلسماتی کہانیاں هیں - لہذا ان ماورائی اور فوق‌الطبعیاتی موضوعات کو بیان کرنے کے لئے ایسی هی مشکل اور دقیق زبان و اسلوب کی ضرورت محسوس هوئی تا کہ ایک سحری ماحول برقرار رہ سکے اور قاری پر گہرا اثر پیدا کر سکے - چنانچہ ان داستانوں کی زبان اور اسلوب مشکل

اور پیچیدہ ہے ۔ اور اکثر مصنفین نے اپنی علمیت کا سکہ جمانے اور قابلیت کا رعب بٹھانے کیلئے ایک ایک لفظ کے کئی کئی مترادفات یکجا کر دیئے ہیں ۔ علاوہ ازیں نامانوس الفاظ، و تراکیب ۔ جملوں میں قافیہ پیمائی، تشبیات کا عام استعمال، بے سروپا باتیں ۔ ضعیف الاعتقادیاں ۔ محیرالعقول واقعات، دہشت و خوف اور اسرار و رموز ان داستانوں کے عام معائب ہیں ۔ طوالت کے خوف کے پیش نظر یہاں صرف ایک داستان فسانہ عجائب از مرزا رجب علی بیگ سرور سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے ۔ ملاحظہ کیجئے کیسی رنگین عبارت ہے۔

آخر کار بعد تکرار عمل کو شکست فاش ہوئی ۔ کوچہ دلبر کی تلاش ہوئی ۔ نام سے نفرت و ننگ ہوئی طبیعت عشق کی محکوم ہوئی، وحشت کی دھوم ہوئی ۔ دامان غیرت و گریبان چاک ہوا ۔ ننگ و ناموس کا قصہ بکھیڑا پاک ہوا ''

یہ داستانیں پوری انیسویں صدی پر محیط ہیں ۔ اگرچہ داستان امیر حمزہ ۱۸۸۳ء میں اور بوستان خیال از صفیر بلگرامی ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئیں تا ہم ۱۸۵۰ء تک داستانوں کا زور ٹوٹ چکا تھا ۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب اردو ادب کے افق پر ایک نیا آفتاب طلوع ہوا جسکی ضیاء باری سے آج ایوان اردو کا گوشہ گوشہ روشن ہے ۔ یعنی ۱۸۵۰ء میں ھی مرزا اسداللہ خاں غالب نے فارسی کی بجائے اردو زبان میں مکتوب نگاری کا آغاز کیا ۔ اور اپنے رشحات قلم سے سرمایا اردو کو فروغ بخشا ۔ اس زمانے میں اردو زبان کو درخوراعتنا نہ سمجھا جاتا تھا اور فارسی کے مقابلہ میں اسکی کوئی وقعت اور عزت نہ تھی کیونکہ فارسی درباری زبان تھی اور ہندوستان میں صدیوں تک اس کا تسلط رہا ۔ اس لئے فارسی میں اظہار خیال مستحسن اور قابل افتخار سمجھا جاتا تھا اور اردو میں لکھنا خلاف متانت جانتے تھے ۔ ان حالات میں مرزا غالب نے جدید اردو نثر کی شمع روشن کی ۔ اور ثابت کر دکھایا کہ اردو نثر کے لکھنے سے کسی کا وقار کم نہیں ہوتا ۔ اور نہ ھی شان گھٹتی ہے بلکہ اپنی زبان اور سادہ نثر میں خیالات، جزبات اور احساسات کا اظہار بدرجہ اتم ہو سکتا ہے اور قاری الفاظ کی بھول بھلیوں اور پیچیدگیوں میں الجھنے کی بجائے مصنف کے خیالات سے پوری طرح مستفید

هوتا ہے اور اس کی نگاہ میں مصنف کے کھوکھلے وقار کی بجائے حقیقی عظمت اور رفعت پیدا ہوتی ہے ۔ مرزا غالب کا یہ اجتہاد تاریخ ادب اردو میں سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے ۔ انھوں نے نہ صرف اردو زبان میں خطوط نویسی کا آغاز کیا بلکہ اپنی جودت طبع سے اس زبان میں ایسے گلزار کھلائے اور مرصع کاری دکھائی کہ آج بھی قاری کی مشام جان معطر اور نگاہ لطف اندوز ہے ۔ اگرچہ اردو نثر میں ان کی کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے اور ان کا تمام نثری اثاثہ مکاتیب ۔ تقاریظ ۔ رقعات ۔ دیباچوں اور تین رسالوں پر مشتمل ہے ۔ تا ہم اس مختصر سرمایا میں وہ سبھی کچھ موجود ہے جس کا تعلق ہماری زندگی سے ہے ۔ اور اس اثاثے میں سب سے زیادہ دلچسپ اور پر لطف مرزا غالب کے خطوط ہیں جو زیادہ تر اردوئے معلے ۔ عود ہندی اور مکاتیب غالب کے عنوانات سے تین مجموعوں کی صورت میں شائع ہوئے ہیں ۔ ان خطوط میں ہی مرزا غالب کی شخصیت، رغبت ۔ کیفیت ۔ انداز تکلم ۔ انداز نگارش ۔ شعر و شاعری اور عزیز و اقارب و احباب سے محبت الفت اور رنج و راحت سب کچھ موجود ہے ۔ ان خطوط کے آئینہ میں مرزا غالب کی داخلی اور خارجی شخصیت کا عکس نمایاں نظر آتا ہے علاوہ ازیں یہ مکاتیب مرزا غالب کے دور کی علمی ادبی اور تاریخی دستاویز ہیں جن کی روشنی میں ہم اس زمانے کی ادبی ۔ تہذیبی ۔ معاشرتی اور سیاسی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں ۔ کیونکہ مرزا غالب نے اس زمانے کی سیاسی اور سماجی حالات کی مفصل تصاویر کھینچی ہیں اور اپنے شوخ قلم سے ان میں رنگ بھرا ہے ۔

جہاں تک ان کی شوخی، طنز اور ظرافت کی عمدگی اور شائستگی کا تعلق ہے اس میں کسی کو کلام نہیں ۔ بلکہ مولانا الطاف حسین حالی نے ''یاد گار غالب'، میں یہاں تک لکھ دیا تھا کہ ''اگر انسان کے بارے میں منطقیوں کی یہ تعریف ہے کہ حیوان ناطق ہے تو مرزا غالب ایک حیوان ظریف تھے ۔'' مرزا غالب کی سنجیدہ طنز و ظرافت سے متاثر ہو کر رشید احمد صدیقی نے کہا تھا ''اردو میں جس شخص نے طنز و ظرافت کو صحیح معنوں میں استعمال کیا

وہ مرزا غالب ہی تھے ۔،، دراصل مرزا کے مزاج میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار میں سر ہوتے ہیں ۔ آن کی کوئی بات ہی شوخی سے خالی نہ تھی ۔ اور ان کی یہ شوخی بالخصوص خطوط میں عجب رنگ دکھاتی ہے ۔ خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو مد نظر رکھتے تھے کہ کوئی ایسی بات لکھی جائے جس سے مکتوب الیہ محفوظ ہو سکے ۔ شوخی تحریر ملاحظ ہو ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ۔ اس میں لکھتے ہیں۔

''دھوپ بہت تیز ہے ۔ روزہ رکھتا ہوں ۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں ۔ کبھی پانی پی لیا ۔ کبھی حقہ پی لیا کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا ۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں ۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا ۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور بہلانا اور بات ہے ۔ ،،

ایک خط میں نواب علاؤالدین علائی کو برسات کی شدت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

''دیوان خانے کا حال محلسرائے سے بدتر ہے میں مرنے سے نہیں ڈرتا فقدان راحت سے گبھراتا ہوں چھت چھلنی ہے ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے ۔،،

ایک صاحب نے آپ کو خط میں دادا جان لکھا تو جواب میں یوں لکھتے ہیں۔
''حضرت میں آپ کا دادا نہیں بلکہ دلدادہ ہوں،،

اسی طرح مرزا حاتم علی بیگ مہر جو اپ کے ہمدرد اور سچے خیر خواہ تھے آن کو چنا جان کی تعزیت میں یوں لکھا ۔

''ہم کو یہ باتیں پسند نہیں ۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے ۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی ۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے نصیحت کی تھی ۔ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں ۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں ۔ پیئو کھاؤ اور مزے اڑاؤ ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی

مکھی نہ بنو ۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے ۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو اپ نہ مرے ۔ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی ۔؟ ازادی شکر بجا لاؤ ۔ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی ۔ وغیرہ ۔''

مشتے از خروارے کے مصداق صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ ورنہ مرزا غالب کی شوخی تحریر کو رقم کرنے کیلئے وسیع و عریض کاغزی پیرھن درکار ہے ۔

مرزا غالب سے قبل خطوط میں بڑے طول و طویل القاب و اداب استعمال کئے جاتے تھے اور تقریباً نصف خط ان القابات کی نزر ہو جاتا تھا ۔ اور مکتوب الیہ القابات و اداب کے چکر میں ایسا پھنستا کہ اصل مقصود سے تہی دست رھتا ۔ ایک مختصر القاب کا نمونہ ملاحظ فرمایئے ۔

''بخدمت جناب مستطاب مستغنی الالقاب فخر الاقران و الاماثل زبدہ‌العلماء و فضلا کثیراللہ مثالک وغیرہ،'' مرزا غالب نے ان طویل اور بے معنی القابات کو یکقلم ترک کر دیا اور ان کی جگہ نہایت مختصر مگر موزوں القابات استعمال کئے اور آن میں حفظ مراتب کا بھی مکمل لحاظ رکھا ۔ مثلاً ۔ میاں ۔ بھائی ۔ حضرت ۔ صاحب بندہ وغیرہ ھم مرزا کی یہ جدت ایسی مقبول ہوئی کہ برسوں تک عوام و خواص اسکی تقلید کرتے رہے ۔ اس کے علاوہ مرزا غالب کی مکتوب نگاری کا نمایاں وصف مکالمہ نویسی ہے ۔ وہ خط اس طرح لکھتے ھیں ۔ کہ یوں معلوم ھوتا ہے کہ جیسے دو آدمی بالمشافہ بیٹھے گفتگو کر رہے ھوں ۔ اور خط پڑھنے سے بالکل بات چیت کا لطف حاصل ھوتا ہے ۔ انھوں نے خود حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط میں لکھا ۔

''میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے ۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو اور ھجر میں وصال کے مزے لیا کرو ۔''

سروینٹر سے لے کر مانتا تک اور چارلس لیمب سے لے کر مولانا ابوالکلام

آزاد تک خط نویسی کے اعتبار سے مرزا غالب نے کچھ ایسی نئی باتیں پیدا کی ہیں جن سے فارسی مکتوب نگاری بھی نا اشنا تھی ۔ یہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دینا جدت و اختراع سے کم نہیں ہے ۔ اگر وہ مرزا تفتہ یا میر مہدی مجروح کو خط لکھتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مرزا تفتہ اور میر مہدی مجروح ان کے دیوان خانے میں بیٹھے ہیں ۔ ایک خط میں میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں ۔

"میر مہدی جیتے رہو ۔ افریں صد هزار افریں ۔ اردو عبارت کا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ھے کہ مجھ کو رشک انے لگا ہے ۔ سنو ! دلی کی تمام مال و متاع و زر و گوھر پنجاب احاطے میں گئی ہے ۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی سو ایک ظالم پانی پتی انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا مگر میں نے اس کو بحل کیا ۔ اللہ برکت دے ۔"

یہ طرز تخاطب کہیں کہیں ابوالفضل کے مکاتیب میں بھی نظر اتا ہے ۔ مگر وہ مکالمہ نگاری کے فن سے نا اشنا تھے جیسے مرزا غالب نے اس خط میں اس فن سے فائدہ اٹھایا ہے ۔

"میں نے پوچھا کہ لوھارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں ۔ اس نے کہا (محمد علی بیگ) ابھی نہیں ہوئیں ۔ میں نے پوچھا کیا آج نہ جائیں گی ۔ اس نے کہا آج ضرور جائیں گی تیاری ہو رہی ہے ۔"

مرزا غالب کے خطوط کا بیشتر حصہ ایسا ہے جس میں انہوں نے قواعد زبان ، اشعار کی تشریح اور کچھ تنقید بیان کی ھے ۔ غالب کوئی دبستانی قسم کے نقاد نہیں تھے اور نہ ہی وہ اصول تنقید سے پوری طرح آگاہ تھے ۔ وہ اصولا ایک شاعر تھے اور ان کی تنقیدیں ذاتی جذبات و احساسات سے متاثر ہیں ۔ انہوں نے فارسی کی ایک لغت "برھان قاطع" پر زیادہ تنقید کی ہے ۔ اور اس کے مصنف محمد حسین کو تختہ مشق بنایا ھے ۔ ان کے زیادہ تر خطوط اسی لغت کی اغلاط کی نشاندھی اور جوابات سے متعلق ہیں ۔ چنانچہ قاطع برھان کے مصنف

مرزا رحیم بیگ کو ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

" قافلہ شد "، یعنی قافلہ رفت یعنی قافلہ سالار رفت یعنی رسول مقبول رحلت کرد ۔ یہ قاف مع الالف میں کلام اسی مستہن رسول کا ہے " دست آب دہ "، کی شرح میں تحقیر اور قافلہ شد میں استہزا ہے ۔ برہان قاطع والا اگر یہ قباحتیں نہیں سمجھتا تو احمق ہے ۔ اگر سمجھ کر لکھتا ہے ۔ تو کافر مطلق ہے ۔ "

ایک اعلیٰ درجے کے تنقید نگار کی نثر سائنسی ہوتی ہے ۔ جس میں جانبداری کے علاوہ ہر بات سادہ نثر میں بیان کی جاتی ہے ۔ اور کوئی بات خیالی اور جذباتی نہیں لکھی جاتی یہ نثر منطقی رو سے مکمل ہوتی ہے ۔ مرزا غالب کی تنقید چونکہ ان کے ذاتی جذبات پر مبنی ہے اس لئے ان کی نثر بھی ایک سائنسی نثر سے زیادہ ادبی ہے جس کی اساس جذبات و احساسات پر ہوتی ہے ۔ ان کی تنقید میں کمی سہی مگر ان کی ادبی نثر امتیازی درجے کی حامل ہے ۔ اسی نثر نے آنے والے دور کو متاثر کیا ۔ اور سر سید کی مدعا نگاری اسی نثر کی مرہون منت ہے ۔ ۔

مولوی عبدالرزاق شاکر کو جو مرزا غالب کے شاگردوں میں سے تھے لکھتے ہیں ۔ ۔

" قبلہ پہلے معنی ابیات بے معنی سنئے ۔ نقش فریادی الخ ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے ۔ جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا پس خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے ۔ یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض موجب رنج و ملال و آزار ہے ۔ "

مرزا غالب کی نثر میں سادگی ، بے ساختگی ، برجستگی اور روانی بدرجہ اتم موجود ہے ۔ جو قدیم اردو نثر میں سرے سے ہی مفقود ہے ۔ نثر میں سادگی کا

عنصر نہ صرف جذبات کو بیان کرنے میں ممد و معاون ہے بلکہ قاری تک اصل مطلب پہنچانے میں مددگار بھی ہے ۔ سادہ نثر کی بدولت پڑھنے والا نفس مضمون سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے اور استفادہ کرتا ہے ۔ مرزا غالب کی نثر اس لئے بھی مؤثر ہے کہ اس میں کسی قسم کی بناوٹ اور تصنع نہیں ہے بلکہ بر جستگی اور بے ساختگی کو ہر جگہ عمل دخل ہے ۔ انہوں نے جہاں مشکل الفاظ کے استعمال کو یک قلم ترک کیا وہاں فارسی کی غیر مانوس تراکیب ، تشبیہات و استعارات سے بھی حتی‌المقدور اجتناب برتا ۔ اسی سبب سے ان کی نثر میں سادگی اور روانی جیسی صفات پیدا ہوئیں سلیس نثر اور مدعانگاری ان کے سادہ الفاظ کی تراکیب میں ملتی ہے ۔ ان کے جملے مختصر اور مکالمے کے پیرائے میں ہوتے ہیں ۔ ان مختصر جملوں میں ان کا شاعرانہ مزاج صاف جھلکتا نظر آتا ہے ۔ اور ان کا انداز تحریر کتابی انداز نگارش سے زیادہ گفتگو کا انداز ہے ۔ جملوں کی ساخت عموماً اس انداز کی ہوتی ہے جیسے کوئی شخص سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہو ۔ گفتگو میں انسان چشم و ابرو کے اشاروں۔ ہاتھوں کی حرکات اور شانوں کی جنبش سے کام لیتا ہے ۔ مرزا غالب کے خطوط میں یہ تمام چیزیں الفاظ کی صورت میں ملتی ہیں ۔ اور قاری مکتوب پڑھتے ہوئے گفتگو کا مزہ لیتا ہے یہاں مرزا غالب کا یہ دعویٰ کہ ” میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ،، سچ معلوم ہوتا ہے ۔

مرزا غالب نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اردو زبان میں لکھے ہیں ان سب میں مسجع و مقفیٰ عبارت لکھنے کا انتظام کیا ہے اس لئے جو بے تکلفی اور صفائی مرزا کے خطوط میں پائی جاتی ہے ۔ وہ تقریظوں اور دیباچوں میں مفقود ہے ۔ اور خصوصاً مسجع کی رعایت نے ان میں آورد اور تصنع کا رنگ پیدا کر دیا ہے ۔ لیکن مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہئے کیونکہ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے وہ ان تکلفات کے بغیر ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے لیکن با ایں ہمہ ان میں سے بعض نثریں جو مرزا نے اپنے مخصوص انداز میں لکھی ہیں نہایت ممتاز اور دلکش ہیں خصوصاً وہ دیباچہ جو انہوں نے مفتی میر لال صاحب کی کتاب ” سراج المعرفتہ ،، پر لکھا اس میں جس خوبی اور متانت سے

تصوف کے اعلیٰ خیالات بیان کئے ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے اردو زبان میں تصوف کے اعلیٰ خیالات نہ اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد کسی نے اس طرح ادا کئے ہیں اس کتاب میں مفتی ہیرا لال نے بہادر شاہ ظفر کے ایماء پر تمام افکار و اذکار جو رسول مقبول کے زمانے سے اس وقت تک سینہ بسینہ چلے آتے تھے ۔ ایک جگہ جمع کئے تھے ۔ مرزا غالب نے اس دیباچہ میں دکھایا ہے کہ ان اشغال و اذکار کو معرفت الٰہی میں کیا دخل ہے اور کیوں کر ان کے ذریعہ توحید وجودی تک سالک کی رسائی ہو سکتی ہے ۔ چند سطریں بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ۔

یہ جو صوفیا کا قول ہے کہ "الولایتۂ افضل من‌النبوۃ" معنی اس کے صاف ہیں اور از روئے انصاف یہ ہیں کہ ولایت نبی‌ص کی وہ وجہ‌الی‌الحق ہے افضل ہے نبوت سے کہ وہ وجہ الی‌الخلق ہے نہ یہ کہ ولایت ہے عام افضل ہے نبوت خاص سے ۔ جس طرح نبی مستفیض ہے حضرت الوہیت سے اسی طرح ولی مستنیر ہے انوار نبوت سے ۔ مستنیر کی تفضیل منیر اور مستفیض کو ترجیح مفیض پر ہرگز معقول اور عقلا کے نزدیک مقبول نہیں ۔ اب وہ ولایت کا خاصہ نبی تھی نبوت کے ساتھ منقطع ہو گئی مگر وہ فروغ کہ اخذ کیا گیا ہے مشکواۃ نبوت سے ہنوز باقی ہے ۔ نقل و تحویل ہوتی چلی آتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے ۔ وغیرہ ہم ۔

غالب کی متصوفانہ شاعری

غالب کے کلام میں صوفیانہ عقائد و افکار کی اتنی بھرمار ہے کہ اسے کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ بعض نقادوں کے نزدیک ان کا یہ تصوف برائے بیت ہے اور بعض کے نزدیک بر بنائے وابستگئی جذبات ۔ کوئی ان کے اس میلان کو مذہب کی ظاہر داریوں سے بچ نکلنے کا ایک بہانہ قرار دیتا ھے اور کوئی مسائل حیات و کائنات کے سمجھنے سمجھانے کا وسیلہ سمجھتا ہے ۔ بعض کا نظریہ ہے کہ غالب کی فطری حسن پسندی اور حسن پرستی نے اس طرف راغب کیا اور بعض اسے تقلید بیدل کا ثمرہ خیال کرتے ھیں ۔ کوئی انہیں نظری و عملی ہر دو طور پر صوفی سمجھتا ہے اور کوئی ان کی اس حیثیت کو یکسر تسلیم نہیں کرتا ۔ بظاہر ان آراء میں ایک طرح کا تضاد ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہے ۔ صرف نقطہ ہائے نظر کا فرق ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ کسی حد تک اس الجھن کے پیدا کرنے میں غالب کا اپنا ھاتھ بھی ھے ۔ بہر حال ان جزوی حقیقتوں کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو غالب کی شاعری کا یہ گوشہ اور ان کی شخصیت کا یہ پہلو ایک بھرپور انداز میں ہمارے سامنے آ جاتے ھیں ۔

غالب کے سامنے اردو صوفیانہ شاعری کی روایت موجود تھی ۔ لیکن ان کے کلام کے مطالعہ اور دوسرے شواھد سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے براہ راست دھلی کے شعرائے متقدمین کی طرز اختیار نہیں کی بلکہ تصوف کا وجود خصوصی مرزا عبدالقادر بیدل ھی کی پیروی اور انداز میں ہے ۔ مولانا حالی کے اس بیان پر کہ ''البتہ اس لحاظ سے کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کم نہیں ۔ ان کی غزل بلا شبہ نظیری کی غزل سے مناسبت رکھتی ھے ۔'' ڈاکٹر وارث کرمانی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ھیں : ''غالب کو نظیری کے تصوف سے متاثر کہنا صحیح نہیں ۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ غالب اور نظیری دونوں تصوف کے شاعر نہیں تھے۔ لہذا ایک دوسرے سے اس ضمن میں متاثر ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ حالی کا بیان بہر حال اپنے اندر ایک حقیقت بھی رکھتا ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ نظیری اور غالب کے یہاں تصوف کے روایتی مضامین قطرہ و دریا کی تمثیل یا دنیا کا عیان ثابتہ کا عکس ہونا یا فنا اور فنائے فنا وغیرہ اکثر باندھے گئے ہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ یہ مضامین اس زمانے میں ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' کے زیر اثر شعر میں لائے جاتے تھے۔ ان کا تعلق شاعر کے دلی جذبات و احساسات سے نہیں تھا۔ ورنہ پھر اس دور کے ہر شاعر کو رومی و سنائی کی طرح تصوف کا شاعر کہنا پڑے گا۔ نظیری اور غالب کا اصل میلان تصوف سے کوسوں دور ہے۔ حالی نے غلطی یہ کی کہ روایتی مضامین کو شاعر کا خاص رنگ سمجھ بیٹھے''(۱)۔ حالی نے غالباً یہ غلطی نہیں کی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حالی اس بات کے معترف تھے کہ غالب نے اس ایک رنگ کے مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھا ہے۔ چونکہ غالب حالی کے نزدیک ''اہل حال'' نہ تھے تو پھر کس طرح تصوف ان کا رنگ خاص قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ غالب کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جنہیں اس انداز میں روایتی قرار دیا جا سکتا ہے مگر متصوفانہ شاعری کے پرکھنے کا یہ معیار کہاں تک درست قرار پائے گا جب یہی تصوف کے روایتی مضامین ایک ایسے شاعر کے یہاں بھی موجود ہوں جو عملی زندگی میں درویش و صوفی بھی ہو۔ خواجہ میر درد کے کلام کا دو تہائی حصہ عشقیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ یہ درست ہے کہ مجموعی طور پر اس حصے کے اکثر اشعار بقول میر تقی میر ع

تصوف میں سب ڈال دیتے ہیں بات خدا رس کہیں ہیں یہ توحید ہے

کے مصداق ہیں مگر معاملہ بندی، شوخئی رندانہ، شبابیات عاشقانہ، خمریات و امرد پرستی غرض‌کہ اس نوع کے اشعار کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔ لہذا انہیں روایتی قرار دے کر ان کے مخصوص رنگ سے خارج کر دیتے ہیں۔ مگر قباحت یہ

---

(۱) غالب کی شاعری کا پس منظر نقوش غالب نمبر ص ۴۸ ببعد

ہے کہ ایک تہائی جو خالص تصوف پر مشتمل ہے اس میں ایسے اشعار مل جائیں گے بلکہ ھیں جن میں تصوف کا محض علمی رخ ہے ۔ غالب کا میدان یقیناً تصوف نہیں ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے یہاں تصوف کے بیان میں روایتی تشبیہات و تمثیلات ھیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ غالب کا مذاق نکتہ آفریں اور انداز تفکر حکیمانہ ہے ۔ لہذا وہ تصوف کی طرف دل کے بجائے ذھن کے راستے سے آئے ۔ رموز کائنات و اسرار حیات کو سمجھنے اور سمجھانے کی طرف ان کا میلان فطری ہے ۔ وہ اپنے متجسس ذھن میں پیدا ہونے والے سوالات کا حل اسی فلسفۂ مذھب و اخلاق میں تلاش کر سکتے تھے جو اس دور میں متداول تھا ۔ چنانچہ اسے ذھنی طور پر قبول کرنے کے بعد انہوں نے اس سے جذباتی وابستگی بھی پیدا کی اور مرتے دم تک تصوف میں گھرے رہے ۔ چونکہ بنیادی طور پر وہ شاعر تھے ۔ لہذا عقلی باتیں بھی درون قلب سے ہو کر زبان شعر پر آئیں ۔ اور ان کے اکثر اشعار اس وجدان اور زندگی کے گہرے شعور کے آئینہ دار ھیں ۔ غالب کے تصوف اختیار کرنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اس کی آڑ لے کر مذھب کی ان ظاھر داریوں سے بچ نکلے جو ان کی ایک طرح کی باغیانہ اور آزادی پسند طبیعت پر بار تھیں ۔ بیدل کی تقلید میں یہی راز پنہاں ہے کہ اس کے یہاں عام مذھبی آزاد خیالی اور وسیع المشربی کا رنگ نمایاں ہے جو غالب کو مرغوب تھا ۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ بیدل کے اس رنگ خاص نے غالب کو بھی متاثر کیا ۔ بہر صورت تصوف کے دائرے ھی میں رہ کر ان کے باغیانہ میلان اور جذبۂ آزادی کا داخلی طور پر اظہار ہو سکتا تھا ۔

ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم لکھتے ھیں : ''غالب خواجہ میر درد کی طرح ولی نہیں تھے البتہ ابراھیم ذوق کی مانند علم تصوف سے آگاہ تھے ۔ اس لیے ان کے ھاں تصوف کے چند مباحث ضرور ھیں لیکن اس کی لذت اور سرمستی نہیں ۔ غالب نے اردو شاعری میں تصوف کے ذوق کو منتقل نہیں کیا ۔ تصوف کے مسائل داخل کیے ھیں جس کا احساس شاعر کو بھی تھا ع

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا'' (۱)

---

(۱) غالب دبستان دھلی کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے (نقوش غالب نمبر ص ۳۸۴)

جہاں تک تصوف کا تعلق ہے یہ حال ہے قال نہیں اور جب پابندی اس حد تک ہو کہ "توحید الہی حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے ساتھ اسرار ہیں جو بیان میں ظاہر نہیں ہو سکتے کہ کوئی شخص اس کو عبارت کے ملمع سے آراستہ کر کے ظاہر کر سکے ۔ کیونکہ عبارت اور جس کو عبارت میں بیان کیا ہے ایک دوسرے کا غیر ہوتے ہیں اور توحید میں غیر کو ثابت کرنا شریک کا ثابت کرنا ہے ۔ تب تو وہ کھیل ہو جائے گا اور مؤحد الٰہی اللہ والا ہوتا ہے نہ کہ لاہی (کھیلنے والا)"(۱) تو یہ کہنا بجا ہو گا کہ تصوف علم سینہ ہے ۔ علم سفینہ نہیں اور شاعری کے ذریعے جو کچھ پیش کیا جا سکا ہے وہ قلب تصوف کی گہراہیوں کو پیش کرنے سے قاصر ہے ۔ ہاں البتہ نقل تصوف کا تعارف ضرور ہو جاتا ہے ۔ جسے تصوف کا علمی رخ کہہ سکتے ہیں ۔ رہی باطنی تجربے اور اس کے شعری اظہار کی بات تصوف اور باطنیت اگر ایک ذوقی اور وجدانی کیفیت کا نام ہے تو شاعری بھی ذوق و وجدان ہی کی آواز ہے ۔ "تصوف اور شاعری اپنی اس قریبی مشابہت کی بنا پر ایک دوسرے سے ہم آغوش نظر آتے ہیں ۔ تصوف وجدان شاعرانہ کی ایک آئینی شکل ہے اور شاعری ذوق صوفیانہ کی ایک والہانہ صورت کہی جا سکتی ہے ۔"(۲) لہذا اس اعتبار سے شاعر کا رسمی صوفی ہونا ضروری نہیں ۔ بلکہ صوفی کا قادرالکلام شاعر ہونا نہایت ضروری ہے ۔ "اغلب یہ ہے کہ روحانی واردات کے لیے رندی اور درویشی دونوں یکساں ہیں ۔ تخلیقی فنکار اپنی نگاہ حقیقت بین میں کتنے ہی عالم دیکھتا ہے اور اس کا مشاہدہ عام انسانوں سے مختلف ہوتا ہے ۔ روحانی واردات کا تضاد اگر دیکھنا ہو تو دنیا داری کی زندگی میں ملے گا ۔ رندی و درویشی دونوں دنیا داری سے مختلف ہیں ۔ حقیقی فنکار محض دنیاوی مسائل سے دو چار نہیں رہتا ۔ خصوصاً تخلیقی لمحے میں وہ گرد و پیش سے بہت بلند ہوتا ہے اور اس کی قوت مشاہدہ اسے ان عالموں کی سیر کراتی ہے جو دنیا سے بہت مختلف ہیں ۔ یہی قوت مشاہدہ فنکار کو حقیقت اشیا تک پہنچاتی ہے ۔"(۳)

---

(۱) کشف المجوب ص ۳۲۲ (اردو ترجمہ) (۲) سید صفی حیدر : تصوف اور اردو شاعری ص ۲۰

(۳) ۔ یوسف جمال انصاری : غالب اور تصوف (نقوش غالب نمبر صفحہ ۵۶۹)

غالب کے مذکورہ مقطع میں مسائل تصوف اور "ولی نہ ہونے" کے اعتراف کو بنیاد بنا کر قیاس آرائی کرنا یا تنقید کے منصب کی بجا آوری کے دوران اسے اپنے خیالات کی تصدیق میں پیش کرنا کسی معقول نتیجے تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے حالی لکھتے ہیں "یہ غزل مرزا نے بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ نے مقطع سنکر کہا بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے ۔ مرزا نے کہا ، حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں مگر یہ اس لیے ارشاد ہوا کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں" ۔ (۱) مرزا کا یہ کہنا لطیفہ کے طور پر سہی مگر ایک جگہ اور کہتے ہیں :

ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

لہذا اس دعوے کو بھی اہمیت دینی چاہیے ۔ بہر حال اس نقطۂ نظر سے اگر غالب کی سوانح حیات اور شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو "غالب اگر شیعہ تھے تو ساتھ ساتھ صوفی بھی تھے ۔ نہ صرف نظری بلکہ عملی طور پر ۔ صوفیانہ وحدت الوجود کو ان کے خیالات میں ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی" ۔ (۲) غالب کے قول و عمل سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے ۔ نواب علاءالدین احمد خاں کو لکھتے ہیں "میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں ۔ زبان سے لاالہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ ، لا موثر فی‌الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں ۔" سرفراز حسین کو لکھتے ہیں "میں صوفی ہوں ۔ ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں ۔ مہدی مجروح کو لکھتے ہیں ۔ "صبر و تسلیم و توکل و رضا شیوہ صوفیہ کا ہے مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا" ۔ خطوط کے علاوہ عام زندگی میں بھی وہ اپنے اس عقیدے کا برملا اظہار کرتے تھے ۔ مولانا حالی نے "راقم کے ساتھ مرزا کا معاملہ" کے تحت ایک دلچسپ واقعہ قلم بند کیا ہے کہ ایک دن نماز پنجگانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا ایکچر غالب کے سامنے لکھ کر پیش کیا کیونکہ وہ بہت اونچا سننے لگے تھے اور بات چیت تحریر کے ذریعے سے کی جاتی تھی ۔ اس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ جس طرح ہو سکے نماز کی پابندی اختیار کریں غالب کو یہ تحریر

---

۱ ۔ یادگار غالب صفحہ ۱۴۸ ۲ ۔ شیخ محمد اکرام : حکیم فرزانہ صفحہ ۲۳۱

ناگوار گزری ۔ خاص طور پر اسوجہ سے بھی کہ لوگ گمنام خطوں کے ذریعے ان کی ذات پر نازیبا حملے کر رہے تھے ۔ غالب نے اس تحریر کو پڑھ کر کہا ۔ ''ساری عمر فسق و فجور میں گزری ۔ نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا ۔ نہ کوئی نیک کام کیا ۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں ۔ اب اگر چند روز بیٹھ کر یا ایماء و اشارہ سے نماز پڑھی تو اس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیونکر ہو سکے گی ۔ میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر جا کر کتوں اور چیلوں اور کوؤں کے کھانے کو ۔ اگر وہ ایسی چیز کھانا گوارا کر لیں ۔ چھوڑ آئیں ۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بد تر سلوک کیا جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں ۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں ۔ لاالہ الا اللہ لا موجودہ الااللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ ۔،، (۱) غالب کے اس بیان سے صوفیہ کے ملامتیہ فرقے کے عمل و انداز کی بو آتی ھے ۔ نیز بعض صوفیہ ظاہری عبادات کی نسبت ذات باری تعالیٰ میں جذب ہونے پر زور دیتے ہیں ۔ وہ اپنی عام زندگی میں اپنے گناہوں کا اعلان کر رہے ہیں ۔ شراب نوشی پر فخرکرتے ہیں ۔ اور ایسے اشعار ۔

زمن حذر نکنی گر لباس دیں دارم — نہفتہ کافرم و بت در آستیں دارم

دلخستہ غمیم و بودسے دوائے ما — باخستگان حدیث حلال وحرام چیست

بہ بت سجدہ زاں رو روا داشتہ — کہ بت را خداوند پنداشتہ

موقوف جرم ہی پہ کرم کا ظہور تھا — بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سر دامن بھی ابھی ترنہ ہوا تھا

کہنے کے ساتھ ساتھ جب وہ کہتے ہیں :

اے دادہ برباد عمر درلہو وفسوس — زنہار مشوز رحمت حق مایوس

ہش دار کز آتش جہنم حق را — تہذیب غرض بودنہ تعذیب نفوس

---

(۱) ۔ یادگار غالب صفحہ ۵۸ ببعد

صرف اعدا اثر شعلہ و دود دوزخ وقف احباب گل و سنبل فردوس بریں
الگی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

تو یوں لگتا ھے جیسے وہ صوفیہ کے فرقہ ملامتیہ مرجیہ سے تعلق رکھتے تھے (۱) اور پھر آخر میں ''لا موثر فی الوجود الا اللہ'' سے جبر کا بھی اظہار ھوتا ھے جو کہ صوفیانہ مسلک میں ایک بنیادی عقیدہ ہے ۔ عملی طور پر غالب پہلے مولانا فخرالدین اور ان کے پوتے مولانا نصیرالدین عرف میاں کالے صاحب سے چشتیہ سلسلے میں بیعت تھے ۔ بہادر شاہ ظفر کی مریدی کا بھی دعویٰ تھا ۔

ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ھیں دو طالب
نظام‌الدین کو خسرو سراج‌الدین کو غالب

ممکن ھے یہ اظہار عقیدت پر خلوص نہ ھو مگر حضرت جی سید علی غمگین شاہ خدا نما کے ساتھ تقریباً سولہ سال غالب کی خط و کتابت رہی ۔ شاہ غمگین شاعری میں اور غالب معاملات تصوف میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے تھے ۔ ''غالب کی دلی تمنا یہ تھی کہ ایک بار گوالیار جائیں اور شاہ غمگین کی خدمت میں حاضر ھوں اور خود غمگین بھی غالب کے چشم براہ تھے ۔ اگرچہ ایسا نہ ھو سکا ۔ غالب اور غمگین کے تعلقات نے غالب پر صوفیانہ افکار کا ایک نیا دروازہ کھول دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غمگین کے نام اپنے خطوط میں غالب نے اعتراف کیا ہے کہ وہ بے رنگی اور دوسرے مشاغل صوفیہ کے دلدادہ بھی تھے ۔'' (۲) غالب کی وسیع‌المشربی ، ظاھری مذھب کے معاملے میں آزادہ روی اور ابتدائے شاعری سے آخری عمر تک تصوف سے گھری دلچسپی ایک واضح طرز فکر اور میلان طبع کی غمازی کرتے ھیں ۔ اس تفصیل کا قطعاً یہ مقصد نہیں کہ غالب کو باقاعدہ صوفی ثابت کیا جائے بلکہ یہ عرض کرنا مقصود ھے کہ تصوف کے سلسلے میں شاعری کی پرکھ کا یہ معیار کہ شاعر صوفی یا ولی بھی ھو ، قابل قبول نہیں ۔ اصل چیز تو واردات قلبی ھے اور یہ صوفی اور شاعر

---

۱ ۔ جو لوگ عمل کیے بغیر اللہ تعالیٰ کی بخشش کی امید رکھتے ہیں۔ انہیں فرقہ مرجیہ کہتے ہیں ۔ (کشف‌المحجوب صفحہ ۱۰۱ حاشیہ)

۲ ۔ غالب اور تصوف (نقوش غالب نمبر صفحہ ۵۸۸)

دونوں میں مشترک ہے ۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ''غالب کوئی حکیم و فلاسفر نہ تھے کہ کوئی نظام کائنات و حیات تلاش و تجویز کرتے ۔ انکی کوئی بھی ذہنی کیفیت کسی نظام کی پابند نہ تھی ۔ دائمی طور پر نہ وہ پر امید تھے نہ مایوس نہ صوفی تھے نہ رند ، نہ خدا پرست تھے نہ بت پرست ، نہ خود دار تھے نہ محروم خودداری نہ خوش تھے نہ غمگین ، نہ بے وفا تھے نہ با وفا ، نہ آہ تھے نہ واہ ، غرض کہ ایک عام حساس انسان کی طرح اور عام شعراء کی طرح ان کی ذہنی کیفیتوں میں اتار چڑھاؤ جاری رہتا تھا ۔ چنانچہ ان کے کلام کی مدد سے انہیں کسی بھی خاص مزاج کا مالک ثابت نہیں کیا جا سکتا،، (۲) انڈر ہل کہتا ہے کہ ''حقیقی تصوف کی بنیاد انسان کی شخصیت میں جا گزیں ہے اسلئے اساسی طور پر وہ ایک ایسی صفت ہے جو صرف قلب سے تعلق رکھتی ہے ۔،، (۱) مگر غالب کا معاملہ جدا گانہ ہے وہ تصوف کو ادراک حقیقت کا ذریعہ بناتے ہیں نہ کہ تذکیۂ نفس کا ۔ کیونکہ غالب یہ کہنے کے باوجود کہ

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

حیات گریزی کے قائل نہیں ۔ وہ فکر و عمل کی نارسائی کو بہانہ بنا کر معنی کے مقابلے میں صورت کو بے اصل تصور نہیں کرتے ۔ حقیقت کا باطن ظاہر میں بھی رونما ہوتا ہے ۔ محرمئی ذات نہ ہو سکے تو محرمئی صفات تو ہو سکتی ہے ۔

عالم آئینہ راز است چہ پیدا چہ نہاں
تاب اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب
گر بمعنی نرسی جلوۂ صورت چہ کم است
خم زلف و شکن طرف کلاہے دریاب

حقیقت اشیاء کے متعلق غالب کے خیالات کا ماحصل بیان کرنے کے لیے شیخ محمد اکرام ''سراج المعرفت،، کے دیباچے سے جو کہ غالب نے لکھا ہے ، ایک مختصر اقتباس پیش کرتے ہوئے حاشیے میں لکھتے ہیں ۔ ''مرزا غالب وحدت الوجودی کو

MYSTICISM.P-82 (۱)

(۲) - محمد منور : مرزا غالب کی فارسی غزل (صحیفہ غالب نمبر حصہ اول صفحہ ۳۲۵

جس حد تک وسعت دیتے تھے وہ اسے اسلامی توحید سے ایک مختلف چیز بنا دیتی تھی ۔ مگر مرزا کو اس کا احساس نہ تھا بلکہ وہ تو اس کو رسول کریم کی تعلیم کا طرہ امتیاز سمجھتے تھے ۔''(۱) اور یہ حقیقت ہے کہ کلام غالب میں جہاں مسلمہ اسلامی عقائد ملتے ہیں وہاں ویدانت ، بدھ مت اور فلاطینوس وغیرہ کے تصورات کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ کیوں کہ ''غالب کا تصوف وہی ہے جو اسلامی ممالک خصوصاً ایران اور ہندوستان کے صوفیوں میں متداول تھا ۔ یونانی اور ہندو فلسفے کا جو اثر اس میں تھا ۔ وہی غالب تک بھی پہنچا ۔ اس میں ان کے ترک و احتساب کو دخل نہ تھا ۔،،(۲) اور پھر ''اکثر صوفیہ نے بھی اس مسئلے میں اسلامی اور غیر اسلامی عناصر میں کوئی بین فرق قائم نہیں رکھا ۔ غالب تو بھلا شاعر ہی ہے ۔ اس کے ہاں قید اور توافق افکار اور واضح تفریق و تمیز کی کیا توقع کی جا سکتی ہے ۔،، (۳) لہذا غالب کی متصوفانہ شاعری کے ضمن میں جہاں تصوف کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے وہاں تصوف کا وسیع تر مفہوم پیش نظر رہا ہے ۔ اس سے مراد خالص اسلامی تصوف نہیں ۔ یوں تو وحدت وجود کا تصور اہل اسلام میں سب سے پہلے تیسری صدی ہجری میں ذوالنون مصری کے اثر تعلیم سے جو اشراقیت جدید سے متاثر تھا رونما ہوا ۔ لیکن چوتھی صدی ہجری میں یونانی فلسفے ، ایرانی عقائد اور ویدانتی تصورات راہ پانے لگے ۔ گروہ متکلمین کے باہمی بحث و مباحثہ سے ایک ماحول عقلیت پیدا ہو گیا تھا ۔ نومسلموں میں ایک مابعد الطبیعاتی نظام فکر قائم کرنے کا شوق پیدا ہونے لگا اور آخرش چھٹی صدی ہجری میں سب سے پہلے شیخ محی الدین ابن عربی نے وحدت وجود کے مسئلے کو فلسفیانہ استدلال کے ساتھ تعلیمات تصوف میں جگہ دی ۔ ''مستند عربی میں وجود کے معنی پہلے ہی سے ہست کے آئے ہیں لیکن جہاں تک ''وجود،، کے لفظ کا تعلق ہے یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ بعد میں وضع ہوا ۔ اس کی ایک ناقابل تردید دلیل یہ ہے کہ وجود کا لفظ نہ زمانۂ جاہلیت کی شاعری میں استعمال ہوا ہے ۔ نہ قرآن مجید اور احادیث میں بلکہ عرب مترجمین نے یونانی فلسفے کے

(۱) حکیم فرزانہ ص ۱۹۷ (۲) ڈاکٹر ابو محمد سحر غالب کا فلسفہ (نگار غالب نمبر : ص ۸۳) (۳) خلیفہ عبدالحکیم : افکار غالب ص ۳۶

لفظ BEING اور EXISTENCE کے لیے ''وجود'' کی اصطلاح وضع کی اور اس کے مفہوم کا دائرہ وسیع کر دیا۔ مثال کے طور پر نہ صرف حقیقت بلکہ اس صدق کو بھی جو حقیقت کی نمائندگی کرتا ہے وجود کہا گیا۔ وجود کا تصور ''الواحد'' کے تصور کے ساتھ ملتبس ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ مسلمان اس طرح اللہ تعالیٰ کے متعدد اور صفات کے ساتھ ''وجود'' کے لفظ کا اضافہ کرنے کے قابل ہو گئے اور بالآخر اللہ تعالیٰ کو واجب الوجود بھی کہنے لگے۔''(۱) ''مسلمانوں میں جب وجود کی وحدت کی بحث شروع ہوئی تو بعض صوفیوں نے اپنا کلمہ بھی عام مسلمانوں سے الگ کر لیا۔ مسلمان کہتا تھا لاالٰہ الا اللہ بعض صوفی کہنے لگے لا موجود الا اللہ (اللہ کے سوا کچھ موجود نہیں) لا مؤثر فی الوجود الا اللہ (ہر وجود میں جو مؤثر قوت ہے وہ خدا ہی ہے) اسلامی توحید کی تعلیم یہ تھی کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اب ایسے لوگ آ گئے جو کہنے لگے کہ خدا کے سوا اور کوئی موجود ہی نہیں۔'' (۲) تصوف کے عملی پہلو سے قطع نظر مسئلہ وحدت الوجود میں مابعدالطبیعات اور تصوف کا موضوع مشترک ہو گیا۔ بات تو صرف اتنی ہے کہ اصل ہستی یا ذات واجب الوجود ایک ہے باقی جو کچھ ہے ہست نما نیست ہے۔ لیکن اس کی افہام و تفہیم اتنی آسان نہیں۔ ہزار ہا سال سے اس مسئلے پر صوفیانہ وجدان، شاعرانہ تخیل اور منطقیانہ استدلال سرگرم عمل ہیں۔ مگر الفاظ کے ہیر پھیر اور اصطلاحات کی آویزش کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ اور یہی کہتے بنتی ہے کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ اختلافات کا آغاز ذات واجب الوجود اور کائنات کے باہمی تعلق کے تعین سے شروع ہوتا ہے۔ یہ نظریہ اسلام سے قبل کے فلسفوں اور فلسفیانہ مذاہب میں بھی ملتا ہے لیکن وہاں بھی یک رنگی و یگانگت نہیں۔

''ویدانت کے مطابق برہم ہی مادہ اور صفت دونوں کے اعتبار سے کائنات کی علت اولیٰ ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہی فاعل حقیقی ہے اور وہی فعل بھی ہے۔ جب مکڑی اپنا جالا تیار کرتی ہے تو وہ خود ہی اس کی صانع ہوتی ہے۔

---

(۱) ڈاکٹر نصیر احمد ناصر : غالب کے چند جمالیاتی تصور (راوی غالب نمبر ص ۳۲ بعبد)

(۲) خلیفہ عبدالکریم : حکمت رومی ص ۱۰۷

بلکہ مکڑی ھی سے جالا وجود میں آتا ہے ۔ اس لیے مادہ کے اعتبار سے بھی وھی جالے کی علت قرار پائی ۔ اس طرح برھم کو بھی دونوں اعتبارات سے کائنات کی علت بتایا جاتا ہے ۔ وہ واحد و یکتا ، قائم بالذات اور قادر مطلق ھے ۔ اس کا وجود حقیقی ہے ۔ وھی ھمہ عقل اور وھی ھمہ مسرت ھے ۔ انفرادی روحیں برھم سے اس طرح ظہور پذیر ھوتی ھیں جس طرح آتش مشتعل سے چنگاریاں ۔ اس لیے روح نہ پیدا ھوتی ھے نہ فنا ھوتی ھے وہ عین برھم ھے ۔ روح کا یہ احساس کہ وہ برھم سے علیحدہ وجود رکھتی ھے دراصل عدم واقفیت سے پیدا ھوتا ہے یہ ناواقفیت دو طاقتیں رکھتی ھے ۔ آورن (جس کا کام حقیقت پوشی ھوتا ہے) اور وکشیپ (جس کا فعل گمراہ کنی ھے) ۔ آورن کی مدد سے یہ ناواقفیت روح کو مصائب ارضی اور احساسات غم و سرور میں مبتلا کر دیتی ہے ۔ بات یہ ہے کہ برھم میں مخلوقات کی طرح کوئی احساس درد و غم و مسرت نہیں ہے ۔ اس لئے روح جب تک اپنے عرفان کی بدولت خود کو اور برھم کو متحد سمجھتی ہے اس پر یہ احساسات طاری نہیں ھوتے ۔ جب وہ اس اتحاد سے ناواقف رھتی ہے تو اس کی یہ لاعلمی ایک پردہ بن کر حائل ھو جاتی ہے اور روح اس اتحاد حقیقی سے آشنا نہیں ھوتی جو اس کو برھم کے ساتھ حاصل ہے ۔ نتیجہ یہ ھوتا ہے کہ کیفیات کے طاری ھوتے ھی احساس وجود پیدا ھو جاتا ہے ۔ اس طرح وکشیپ کے عمل کی وجہ سے روح اپنی اصلیت سے ھٹ کر کثرت پرستی کے انتشار میں مبتلا ھو جاتی ہے ۔ اس لئے ویدانت کا مقصد یہ ھے کہ روح کو جسمانی تعنیات سے آزاد ھو کر اپنے سرچشمۂ نور و وجود یعنی برھم سے واصل ھو جانا چاھیے ۔“(۱)

”نو فلاطونیت کے مطابق ھستئی مطلق ، نور مطلق ھے جو ماورائے روح و نفس اور ماورائے عقل و ادراک ہے ۔ اس پر کسی صفت کا اطلاق نہیں ھوتا ۔ تمام رنگ اسی سے نکلتے ہیں لیکن وہ خود بے رنگ ھے ۔ تمام صفات درجہ بدرجہ اس سے سرزد ھوتے ھیں ۔ لیکن وہ اپنی ذات میں کسی صفت کا حامل نہیں ۔ اس نور کا اشعاع ازلی ھے یہ نور ازلی بے شعور و بے ارادہ ھے ۔ اس نور میں اپنے مرکز سے پھیلتے

(۱) تصوف اور اردو شاعری ص ۵۳ ۔

ہوئے درجہ بدرجہ تنزل ہوتا ھے ۔ ان تنزلات میں جو چیز مرکز نور سے اقرب ھے وہ نسبتاً افضل ھے ۔ جو چیز نور سے جتنی دور ہے وہ حقیقت ازلی سے اسی قدر مہجور ہے اس قریب ترین عقل کل ھے اور بعید ترین مادہ محض ھے جسے ''ظلمات ،طاقہ،، کہہ سکتے ھیں اور جو عدم کے مساوی ہے ۔ انسان کا انفرادی نفس اپنے تنزلات کے ایک درجے میں پیدا ہوتا ھے اس کی آفرینش کسی صاحب مقصد مشیت نے بالارادہ نہیں کیا ۔ ارادے اور مقاصد تنزلات کی پیداوار ہے ۔ اس لیے ھستئی مطلق کے اندر ان کا کوئی وجود نہیں ۔ حقیقی وجود ایک ھی ھے جس سے تنزلات میں ہر درجہ اور ہر شے بقدر مراتب بہرہ ور ھے ۔ ہر شے کی حقیقت اتنی ھی ہے جتنا کہ نور ازلی سے حصہ ملا ھے ۔ جس طرح سورج کی کرن کا وجود بالذات اور مستقل نہیں اسی طرح تنزلات کے کسی درجے میں کوئی شے مستقل انفرادی وجود نہیں رکھتی ۔،،(۱)

شیخ محی الدین ابن عربی نے مسئلۂ وحدت الوجود کی جو شرح و بسط کی ہے اس کا ماحصل مختصراً یہ ہو سکتا ھے کہ حقیقی وجود کے اعتبار سے وحدت ھی وحدت ھے ۔ کائنات کا وجود حقیقی نہیں ۔ لہذا اسے وحدت محض میں منحصر کر دینے کے بعد اس کے وجود کا انکار کرنا لازمی ہے ۔ کائنات کیا ھے ۔ خدا کے وجود کا صرف پرتو ہے ۔ خدا کی صفات میں اگرچہ تعدد ھے لیکن تمام صفات عین ذات ھیں ۔ اس لیے کائنات اور ذات میں عینیت کا تعلق ہے اور قائم بالذات چونکہ وحدت مطلقہ ہے ۔ اس لیے وجود وحدت ھی وحدت کا ھے ۔ اس عقیدے کو ''ہمہ اوست،، سے تعبیر کیا جاتا ھے ۔

کائنات و خدا میں رشتہ عینیت قائم کرنے کا نظریہ نفی کائنات سے بھی ثابت کیا گیا ہے ۔ حضرت مجدد کہتے ھیں کہ اس قسم کی نفی حقائق سے بوئے سوفسطائیت آتی ھے(۲) دراصل یہ خیال ویدانت کے بہت قریب ھے ۔ جس میں ھستئی مطلق صفات سے معرا ہے ۔ اس میں خالقیت کی صفت بھی نہیں جسے مخلوقات کہتے ھیں وہ فریب نظر اور وہم کی آفرینش ھے ۔ اس میں نفی مسلم ہے اور اثبات موہوم ۔ وحدت

---

(۱) حکمت رومی ص ۱۰۶ (۲) Dr. BURHAN-UD-DIN : MUJADDID'S CONCEPTION OF TAWHID—P-105

حقیقی ہے اور تمام کثرت مایا ۔ غالب کے یہاں اس خیال کے متعدد اشعار ملتے ہیں۔

کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد عالم تمام حلقہ دام خیال ہے (۱)
عالم غبار وحشت مجنوں ہے سربسر کب تک خیال طرہ لیلیٰ کرے کوئی

غالب کے نزدیک وسوسہ اور وہم سے کچھ حاصل نہیں ۔ دنیا ایک سراب ہے اور وہ خود بھی اس کی ایک لہر ہے ۔ پردۂ وہم پر جو کچھ ابھرتا ہے ۔ پر عنقاء کا نقش و نگار ہے یعنی معدوم ہے ۔ ہستئی اشیاء کہاں یہ تو فنا کا غبار ہے اور سب کا سب سیمیا یا نظر فریبی کی کارستانی ہے :

اے ہمہ تن وسوسہ سود تو کو دہر سراب است وجود تو کو
ہر چہ ازیں پردہ ہویدا ستے نقش و نگار پر عنقا ستے
ہستئی اشیاء کہ غبار فنا ست پردہ کشائے اثر سیمیا ست

اور یہ خارجی دنیا ہی نہیں وجود خلق بھی موہوم و معدوم ہے :

ز وہم نقش خیالے کشید ای ورنہ وجود خلق چو عنقا بدہر نایاب است
خلق کہ از وہم نمودیش ہست وہم تو دانست کہ بودیش ہست

آورن کے باعث احساس وجود پیدا ہوتا ہے اور وکشیپ کثرت پرستی کی طرف مائل کرتی ہے لیکن کثرت کو تسلیم کرنا تو کفر ہے ۔ حقیقت میں تو وحدت ہے :

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

ابن عربی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے بہت سے نام ہیں ۔ جیسے رحمن ، رحیم ، قہار وغیرہ ۔ یعنی مسمیٰ واحد اور اسما متعدد ہیں ۔ لیکن ہر اسم سے مراد ایک ہی ذات ہے ۔ گویا تمام اسماء مسمیٰ کے عین ہیں ۔ تمام اسماء و صفات پر دلالت کرتے ہیں صفات سے ممکنات کا ظہور ہوا جس کے یہ معنی ہوئے کہ کائنات کی ہر شے کسی نہ کسی اسم کی مظہر اور اس کا مستویٰ ہے (۲) لیکن غالب کا رجحان ویدانت کی طرف زیادہ ہے ۔ وہ صورت عالم کو اسم بے مسمیٰ قرار دیتے ہیں ۔ ان کے نزدیک

(۱) درد : مت جا تر و تازگی پہ اس کی عالم تو خیال کا چمن ہے

(۲) - مقدمہ فصوص الحکم صفحہ ۲۹

صورت اشیاء وهم یعنی مایا سے زیادہ نہیں ۔

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور　جز وہم نہیں صورت اشیاء مرے آگے

نفی کی یہ لے اور تیز ہو جاتی ہے ۔ قصیدہ در منقبت حضرت علی میں اسی منفیانہ نقطہ نظر کا بھر پور اظہار ہے کہ غالب تمام ہنگامہ حیات کو لغو و ولا یعنی سمجھتے ہیں ۔

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق　بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین
ہرزہ ہے نغمہ زیر و بم ہستی و عدم　لغو ہے آئینہ فرق جنون و تمکین
یاس تمثال بہار آئینہ استغناء وہم　آئینہ پیدائی تمثال یقیں
لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم　درد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا وچہ دیں
نقش معنی ہمہ خمیازہ عرض صورت　سخن حق ہمہ پیمانہ ذوق تحسین
عشق بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس　وصل زنگاہ رخ آئینہ حسن یقین
کوھکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب　بے ستوں آئینہ خواب گران شیریں
موج خمیازۂ یک نشہ چہ اسلام چہ کفر　کجی یک خط مسطر چہ تو ہم چہ یقین

حتی کہ ”عدم وجود“ کا اثباتی انداز تک انہیں پسند نہیں۔ لوگ عالم کو شاہد ہستی کی کمر قرار دیتے ہیں ۔ چونکہ معشوق کی کمر معدوم ہے اس لیے عالم بھی معدوم ہے ۔ مگر یہ طرز ایجابی ہے ۔ کیونکہ اس میں ”ہے“ موجود ہے ۔ معدوم محض کے لیے اس ایجابی دعویٰ سے بھی التباس پیدا ہوتا ہے ۔

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم　لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

جب اس نفی کی لے ذرا مدھم پڑتی ہے اور کثرت کی جلوہ آرائی کے سامنے یہ خیال کہ ہستی مطلق بے صفات و بے اضافات ہے (۱) دم توڑنے لگتا ہے ۔ تو غالب حیرت و استفہام کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں ۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

---

۱ ۔ نکو گوئی نکو گفت است در ذات　کہ التوحید اسقاط الاضافات

شکن زلف عنبریں کیوں ہے نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ گل کہاں سے آتے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

غالب کی یہ حیرت محمود ہے کیونکہ،، معرفت ہمیشہ کی حیرانی ہے ۔ اور حیرانی دو قسم کی ہوتی ہے ۔ ایک تو وجود کے متعلق دوسرے اس کی کیفیت کے متعلق ۔ وجود الہی کے متعلق حیرانی شرک و کفر ہے ۔ اور کیفیت میں حیرانی معرفت ہے،، (۱) اور غالب کی حیرت وجود مطلق کے بارے میں نہیں عقل فعال پہلے ہی انہیں اس راز سے آگاہ کر چکی ہے ۔

گفتم اسرار نہانی ز تو پرسش دارم گفت جز محرمی ذات کہ بے چون و چرا است

ان کی حیرت تو صفات و مظاہر ، تنزلات و کیفیت یعنی وجود کائنات و خلق سے متعلق ہے ۔ چنانچہ انہیں یہ احساس ہونے لگتا ہے ۔

اے گرفتار خم پیچ و خیال نفی بے اثبات نبود جزضلال

اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ

ہے تجلی تری سامان وجود ذرہ بے پر تو خورشید نہیں
ہے کائنات کو حرکت ترے ذوق سے پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

تو انہیں معرفت حاصل ہو جاتی ہے ۔ با یزید رحمتہ اللہ فرماتے ہیں : ''معرفت یہ ہے کہ تو جان لے کہ خلقت کی سب حرکات و سکنات اللہ تبارک تعالیٰ کی وجہ سے ہیں،، (۲)

چنانچہ وہ کائنات کو قائم بالحق سمجھتے ہیں ۔ ''عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے،، کی توضیح ان کے یہاں ملتی ہے ۔ ''اگر عالم کو صحیح طور پر صفات الہیہ کا مظہر سمجھا جائے اور جز ومیں کل (۳) اور ہر جلوۂ صفت میں ذات مطلق کی شان نظر آئے تو اس تجلی کو خدا کی اپنی خیال آفرینی ہی تصور کیا جائے گا ۔ ذات مطلق کے مقابلے میں اس کی حقیقت بھی ثانوی اور تغیر پذیر رہے گی لیکن ذات مطلق سے

---

۱ - کشف المحجوب صفحہ ۳۰۸
۲ - کشف المحجوب صفحہ ۳۰۹
۳ - قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا

وابستگی کی وجہ سے مطلقاً بے حقیقی نہ ہوگی،، (۱) غالب کہتے ہیں :

نہ ہر گہ کہ تنہا نشینی بجائے بخاطر کنی طرح بستان سرائے
دمانی گل و نرگس ارزوئے خاک نشانی بطرف چمن سرو و تاک
نواگر کنی مرغ بر شاخسار بموج آوری آب در جوئبار
بخویش ارچہ داری گمانے ز باغ بروں از تو نبود نشانے ز باغ
در اندیشہ پنہاں و پیدا توئی گل و بلبل و گلشن آرا توئی

جس طرح ہم اپنے خیال میں ایک باغ تعمیر کر سکتے ہیں اس طرح خدا اپنے خیال سے جہانوں کی تعمیر کر سکتا ہے ۔ یہ ایزدی سیمیا ہماری دانست اور حس کے لیے دیرپا ہوتی ہے ۔ چونکہ خدا نے اس کے ساتھ وقت یا زماں کا بھی اضافہ کر دیا ہے ۔

نمود دو گیتی بہ گیتی خدائے چنیں است دیگر ندانیم رائے
و لیکن چوں ایں ایزدی سیمیاست بہ انست حسی چنیں دیر پاست
نمودنے کہ حق راست نبود چرا زماں چوں از انجاست نبود چرا

جب غالب یہ راز پا لیتے ہیں تو جس اردو قصیدے میں انھوں نے نفی پر زور دیا تھا اس میں نئے مطلع کا اضافہ کرکے بقول شیخ محمد اکرام شدت نفی کا تریاق پیش کرتے ہیں :

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں(۲)

اور حسن کی خود بینی جہاں عشق آفریں ہے وہاں حسن آفرینی کے فعل کو جاری رکھے ہوئے ہے ۔ سارا عالم کل یوم ھو فی شان کی تفسیر ہے :

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں(۳)

غالب نفی سے اثبات کی منزل میں آ گئے ۔ ان پر یہ راز آشکار ہو گیا کہ

---

(۱) افکار غالب صفحہ ۵۶
(۲) پہلے مطلع یہ تھا :
توڑے ہے عجز تنک حوصلہ بر روئے زمیں سجدہ تمثال وہ آئینہ کہیں جسکو جبیں
(۳) اقبال : گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں ہزار بادہ نا خوردہ در رگ تاک است

موجودات هستی وہم اور مایا نہیں بلکہ قائم بالحق ہیں لیکن وہ اس مقام پر زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے۔ آفاق و انفس ایک دوسرے میں مدغم ہوتے نظر آئے۔ وہ سوچنے لگے۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے   حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جب تمام مرئی وجود (مشہود) اور اہل نظر (شاہد) اور نظر (مشہود) کی حقیقت ایک ہی ہے تو مشاہدہ کس کا اور کرنے والا کون ؟ اور پھر وحدت الوجودی انداز میں پکار اٹھے۔

چو پیدا تو باشی نہاں ہم توئی   اگر پردہ باشد آں ہم توئی
جہاں چیست آئنہ آ گہی   فضائے نظر گاہ وجہ الٰہی
چوں ایں جملہ را گفتہ عالم اوست   بگفت آنچہ ہرگز نیاید ہم اوست

تو ہی ظاہر ہے اور تو ہی باطن۔ اگر دونوں کے درمیان کوئی پردہ ہے تو وہ بھی تو ہی ہے۔ یہ جہاں کیا ہے ؟ اپنی آگاہی کا آئنہ ہے۔ اور اس میں سب وجہ اللہ کا منظر ہے۔ غرض جسے عالم کہتے ہیں وہ ہستئی مطلق ہی ہے جو کچھ بیان میں نہ آ سکے وہ بھی وہی ہے۔ کیونکہ ذات صفات کی عین ہے کائنات صفت کی تجلی ہے۔ اور چونکہ صفات عین ذات ہیں اس لیئے کائنات بھی عین ذات ہے۔ لیکن کبھی کبھی انہیں اپنے اس عقیدے پر شک بھی گزرتا ہے۔ اور ان کا یہ شک انہیں صحیح اسلامی توحید کیطرف لے آتا ہے۔ ایک لحاظ سے خدا اپنے ہر مظہر اپنی ہر آیت اور اپنی ہر مخلوق شے میں موجود ہے لیکن دوسرے لحاظ سے کوئی شے خدا کی عین ذات نہیں۔

لیس کمثلہ شیٔ

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے   پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

اور واقعی :

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست   لیکن نمی تواں کہ اشارت با وکنند

وحدت الوجود کا نظریہ جگہ جگہ شریعت سے ٹکراتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی

نے وحدت الوجود کی تردید کی اور وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا ۔ ابن عربی کا استدلال یہ تھا کہ ذات صفات کی عین ہے ، کائنات صفات کی تجلی ہے اور چونکہ صفات عین ذات ہیں اسلئے کائنات بھی عین ذات ھے ۔ مگر حضرت مجدد کہتے ھیں کہ صفات عین ذات نہیں بلکہ زائد علی الذات ہیں ۔ وہ کشف صحیح کی بناء پر اس کے قائل ھیں کہ وجوہ باری فی ذاتہ کامل و آکمل ہے ۔ صفات اس کے وجود کی تعنیات ھیں ۔ " ثبوت یہ ہے کہ صفات کامل ھیں ، کائنات ناقص ہے ۔ معلوم ھوا کہ کائنات تجلی صفات نہیں بلکہ ظل صفات ھے اور ظل کبھی عین اصل اور مظہر کبھی عین ظاہر نہیں ھوتا(۱) وہ توحید وجود کو علم‌الیقین اور توحید شہودی کو عین‌الیقین قرار دیتے ھیں ــ مگر غالب غالباً توحید شہودی کے قائل نہیں ۔ کہتے ھیں :ــ

ناکامی نگاہ ھے برق نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھکو تماشا کرے کوئی
جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیم روز
آپ ھی ھو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں
ھے غیب غیب جسکو سمجھتے ھیں ھم شہود
ھیں خواب میں ھنوز جو جاگے ھیں خواب میں
خیالے در اندیشہ دارد نمود
ہماں غیب غیب است بزم شہود

ویدانتی فلسفے میں مایا بھی برھما ہے ۔ یعنی برھما اس دنیا میں اپنی مایا کے ذریعے بطور صورت عالم ظاہر ھوتا ہے ۔ اور وحدت الوجودی فلسفے میں کثافت کائنات لطافت ذات کی مظہر ہے ۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ھے آئینہ بادبہاری کا

ویدانتی فلسفے کا ایک گروہ اس بات کا قائل ھے کہ اگر خدا فی ذاتہ مکمل ترین ہے تو پھر کائنات تخلیق کرنے کا مقصد کیا ہے ۔ اور اگر کوئی مقصد تھا تو اس

---

(۱) مکتوبات امام ربانی جلد اول (مکتوب نمبر ۳۱)

مقصد کی تکمیل کے بغیر خدا کی ذات مکمل نہیں ہو سکتی تھی ۔ بہر حال ان کے خیال میں کائنات ایشور کی لیلا (ناٹک کھیل تماشا) ہے ۔ غالب کہتے ہیں ۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

بدھ مت میں کہیں خدا کا تصور نہیں ۔ نفسی مظاہر اور طبیعی مظاہر سب آرزوئے حیات کی پیداوار ہیں ۔ آفاق و انفس کی کوئی حقیقت نہیں ۔ آرزوئے حیات کی نفی کے بعد یہ ناپید ہو جاتے ہیں ۔ ان کی ہستی سیمیائی ہے ۔ غالب کہتے ہیں ۔

یہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود صبح کو راز مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

لا موثر فی الوجود الا اللہ (ہر وجود میں جو موثر حقیقت ہے وہ خدا ہے) سے جب عقلی نتائج نکالے جائیں تو تمیز خیر و شر کمزور ہو جاتی ہے اور حفظ مراتب دشوار ہو جاتا ہے ۔ مسلمانوں میں مسئلہ تقدیر کے اختلاف پر جبر و قدر کے عقیدے وجود میں آ گئے ۔ بنی امیہ کے دور اقتدار میں عقیدہ جبر پر زور دیا گیا تاکہ اعمال مذمومہ کی ذمہ داری سے بچا جا سکے ۔ جہم ابن صفوان نے باقاعدہ اس عقیدے کی تلقین کی اس کے خلاف معبدالجہنی نے نظریہ قدر کی تعلیم دی ۔ اور اس نے بنی امیہ کو نفاق بین المسلمین کا مجرم قرار دیا ۔ اس کی پاداش میں خلیفہ عبدالملک کے ایماء پر عامل عراق حلاج نے اسے قتل کروا دیا ۔ اس کے بعد غیلان دمشقی نے عقیدۂ قدر کی تعلیم کو جاری رکھا مگر وہ بھی بالآخر ھشام ابن عبدالملک کے حکم سے تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا (۱) جبر اور قدر دونوں عقیدوں کا ماخذ قرآن حکیم ہے ۔ مگر ہر فرقہ اپنے مطلب کی آیات سے کام چلاتا تھا ۔ یہ دونوں نقطہ ہائے نظر انتہا پسندانہ ہیں ۔ ''اور حقیقی موحد کو لازم ہے کہ قول میں جبری ہو (انسان وہی کر سکتا ہے جو مقدر ہو) اور فعل میں قدری ہو (انسان فعل مختار ہے) تاکہ اس کا طریق عمل

Muslim thought & its sources-Muzaffaruddin (۱)

جبر و قدر کے درمیان ہو جائے،، (۱) مگر وحدت الوجودی فلسفے کا منطقی نتیجہ جبر ہے ۔ لہذا اخلاق تعطیل ہو جاتی ہے ۔ نیکی اور بدی کو ایک ہی وجود کے مظاہر خیال کرنے سے خیر و شر کا امتیاز اٹھ جاتا ہے ۔ غالب اہل معنی کی سرمستی اور اہل بابل کی جادو گری دونوں خدا کی طرف سے خیال کرتا ہے فلک کی غارت گری بھی خدا کے حکم سے ہے اور چور جو کچھ چراتا ہے ۔ وہ اس کے خزانے میں داخل کر دیتا ہے ۔

نشاط معنویان از شراب خانہ تست　　فسون بابلیان فصلے از فسانہ تست
سپہر را تو بتاراج ما گماشتۂ　　نہ ہر چہ دزد زما برد در خانہ تست

حتی کہ جواز مے کے لیے شرعی حکم کو دروغ مصلحت آمیز قرار دیتا ہے ۔

از مے ترا ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند　　آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

خدا نے خود ہی اپنے ماسوا کا دھوکا پیدا کیا ۔ حرف کن کہہ کر اپنے آپ کو اس گمان کا شکار کیا کہ مخلوق خالق سے کوئی الگ ہستی ہے ۔ ظاہر و باطن میں وہی ہے مگر رسم عبادت کا ایک موہوم پردہ درمیان میں ڈال دیا ہے ۔

اے زوہم غیر غوغا در جہاں انداختہ　　گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ
دیدہ بیروں و دروں از خویشتن پروانگہی　　پردۂ رسم پرستش در میاں انداختہ

بہر حال اس قبیل کے بہتیرے اشعار غالب کے یہاں موجود ہیں ۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی
بر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے　　یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا
ہےوہی بد مستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ　　جس کے جلوے سے زمین تا آسماں سرشار ہے

تصوف میں فنا کے بارے میں اختلاف رائے ہے ۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ جزو کی انفرادیت بالکل ختم ہو جائے اور وہ کل میں مدغم ہو جائے ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ''من تو شدم تو من شدی،' کے باوجود ذاتی تفاوت باقی رہے ۔ غالب کہتے ہیں ۔

---

(۱) کشف المجوب ۶۳

دل ہر قطرہ ہے ساز اناالبحر　　ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں
عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے　　کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ فنائے کامل ہے ؟ جسم و روح کی مکمل فنا۔ یہ انضمام و حلول یا اس نوعیت کا وصل تو اسی وقت ممکن ہے جب ویدانت کے اس بنیادی اصول کو مان لیا جائے کہ ترک لذات سے فانی غیر فانی ہو جاتا ہے اور برھما میں فنا ہو جاتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے تو ''وصل بفصل'' ہی ہو سکتا ہے غالب کے یہاں یہ خیال بھی ملتا ہے۔ وہ عقل فعال سے پوچھتے ہیں کہ ذرہ ذرہ ہی رہتا ہے یا ہمہ تن آفتاب بن سکتا ہے۔

گفتمش ذرہ بخورشید رسد گفت محال　　گفتمش کوشش من در طلبش گفت بجاست

جواب قرین حقیقت ہے کہ ذرہ خورشید نہیں بن سکتا۔ ہاں البتہ خورشید ازلی سے قرب کی کوشش اس کا مقصود حیات ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ غالب ویدانت کے فلسفہ فنا کے قائل ہونے کے باوجود ترک دنیا نہیں کرتے۔ یہ ذرہ خورشید بننے کی سعی لا حاصل میں لگا رہتا ہے یہی اس کی زندگی ہے جو غالب کے کلام میں ایک نہ مٹنے والی آرزو کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ وہ ہستی کو نیستی کے برابر سمجھتے ہیں مگر ہستی کی بے ثباتی سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہنگامی طور پر بھی اس سے لطف نہ اٹھایا جائے۔

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ　　اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے　　طراوت چمن و خوبیٔ ہوا کہیے
نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے　　روانیٔ روش و مستی ادا کہیے

پروفیسر ملک اورخان شاہین

غالب کی انانیت

دیوان غالب ، مقدس وید کی طرح ہندوستان کی الہامی کتاب ہو یا نہ ہو اس کا مصنف ضرور کرہ ارض کے عظیم شعراء کی صف میں شامل ہو گیا ہے۔ اُس کی عظمت کی دلیل یہ کیا کم ہے کہ آج دنیا کے تقریباً تمام علمی و ادبی حلقوں میں اُسکی سوویں برسی کی تقریبات بڑے جوش سے منائی جا رہی ہیں۔ سلطنت مغلیہ کے تین تحفے غالب اردو اور تاج محل ، گنوائے جاتے ہیں۔ لیکن تاج محل ڈھ بھی سکتا ہے۔ اردو کو شدھی بنا کر ہندوستان سے تو کم از کم اس کا نام و نشان مٹایا جا رہا ہے صرف غالب ایسا تحفہ ہے جس کی عظمت و شہرت ہندوستان تک ھی محدود نہیں بلکہ بین‌الاقوامی سرحدوں کو چھو رہی ہے۔ لوگ نواب اسد اللہ خاں بہادر کی نسبت غالب شاعر سے زیادہ متعارف ہیں۔ اگر نفسیاتی طور پر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ھوتا ہے کہ یہ غالب کی نوابیت افراسیابی خون اور اپنی انا کا شدید احساس ہی ہے جس نے غالب کو غالب بنایا۔ یہ خوداری۔ احساس کمال۔ فنی برتری۔ عزت نفس اور وضع داری جسے ہم غالب کی انانیت ، کہہ سکتے ہیں جو ان کے کلام کے ہر شعر ، ہر مصرعے بلکہ ہر لفظ سے عیاں ہے۔ ان کی مشکل پسندی ، جدت و اختراع ، روایت شکنی ، فعالی اور مثبت زاویہ نظر ، فلسفیانہ انداز فکر اور طنز و ظرافت کے مختلف روپ اسی انانیت سے جنم پاتے ہیں۔

مرزا کی انانیت و خود پرستی ان کی خاندانی وجاہت ”نسلی برتری اور طبقاتی بلندی کے شدید احساس کا نتیجہ ہے۔ وہ خود کو سلجوق‘ سمر قندی اور ایبک ترک بتاتے ہیں۔ والد فوجی عہدیدار تھے چچا کی زندگی بھی سپاہیانہ تھی۔ مرزا ابھی چھوٹے سے تھے کہ والد اور چچا چل بسے ننھیال والے خاصے

کھاتے پیتے رئیس تھے ۔ ان کا بچپن آگرے میں بڑے عیش و عشرت میں گذرا کنکوے اڑائے ۔ شطرنج کھیلی ۔ چوسر و گنجفہ کبوتر بازی اور عشق بازی تک لڑکپن میں لہو و لعب کے کسی شعبے میں بس نہ تھے ۔ بگڑے ہوئے امیر زادے کی رنگ رلیوں پر پہرہ بٹھا دیا گیا ۔ تیرہ برس کی عمر میں بیڑی پہنا دی گئی یعنی ریاست لوھارو کے نواب خاندان میں مرزا کی شادی ہو گئی ۔ چودہ برس کے تھے کہ آگرہ چھوڑ دھلی آ گئے ۔ یہاں کے حلقوں میں پذیرائی ہوئی ۔ شرفاء میں اٹھنا بیٹھنا رھا ۔ قلعہ معلیٰ سے تعلق قائم ہوا ۔ یہاں کی تہذیبی زندگی کا ان پر کافی اثر ہوا ۔ ہر بات میں اپنی وضع داری و خودداری کو برقرار رکھا ۔ دلی کالج کی پروفیسری پر اس لئے لات مار دی کہ نواب صاحب پالکی میں سوارھو کر انٹرویو کے لئے گئے اور استقبال کے لئے پرنسپل صاحب حاضر نہ ہو سکے ۔ وبا میں اس لئے مرنا پسند نہ فرمایا کہ ,, دھنیے ۔ نورباف ۔ نائی ۔ قصائی سبھی مرے جا رہے تھے،، ۔ مکان کرائے کا تھا مگر اندر باھر بیس کے قریب شاگرد پیشہ متعین تھے ۔ رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے ۔ ذاتی آمدنی کا مستقل ذریعہ کوئی نہیں تھا ۔ پنشن بہت معمولی تھی ۔ فضول خرچی بلکہ شاہ خرچی کا یہ عالم تھا کہ قرض کی پیتے ، فاقہ مستی میں رہتے ، پر تمنا یہ تھی کہ جس شہر میں رہوں وہاں وئی بھی بھوکا نہ رہے ۔ منشی شیو نارائن کو لکھتے ہیں ۔

”نواب اسداللہ خاں لکھو یا مرز اسداللہ خاں ، بہادر کا لفظ دونوں حال میں واجب اور لازم ہے،، ۔ خود کو عرفی ، ظہوری اور نظیری کا ہم پلہ سمجھتے ۔ کسی کے قول کو سند نہ مانتے ۔ اسی انفرادیت پرستی کی وجہ سے قتیل کے متعلق ایسا ادبی قضیہ کھڑا کیا جو مرتے دم تک گلے کی پھانس بنا رہا ۔ ذوق کے جیتے جی شاہی دربار میں اتنے مقبول نہ ہو سکے ۔ قصائد میں بادشاہ کی اور اپنی تعریف کا پہلو نمایاں ہوتا ۔ دیکھئے اس کا اعتراف کتنے فخر سے فرماتے ہیں ۔

”قصائد کی تشبیب میں تو میں گرتا پڑتا ان نازک خیالوں اور بلندیوں تک پہنچ جاتا ہوں جہاں عرفی و انوری پہنچ جاتے ہیں مگر مدح و ستائش میں مجھ سے ان کا ساتھ نہیں دیا جاتا،، انہی نازک خیالوں اور بلندیوں تک پہنچنے کی

غالب کی انانیت

دیوان غالب ، مقدس وید کی طرح ہندوستان کی الہامی کتاب ہو یا نہ ہو اس کا مصنف ضرور کرہ ارض کے عظیم شعراء کی صف میں شامل ہو گیا ہے ۔ اس کی عظمت کی دلیل یہ کیا کم ہے کہ آج دنیا کے تقریباً تمام علمی و ادبی حلقوں میں اسکی سوویں برسی کی تقریبات بڑے جوش سے منائی جا رہی ہیں ۔ سلطنت مغلیہ کے تین تحفے غالب اردو اور تاج محل ، گنوائے جاتے ہیں ۔ لیکن تاج محل ڈھ بھی سکتا ہے ۔ اردو کو شدھی بنا کر ہندوستان سے تو کم از کم اس کا نام و نشان مٹایا جا رہا ہے صرف غالب ایسا تحفہ ہے جس کی عظمت و شہرت ہندوستان تک ہی محدود نہیں بلکہ بین الاقوامی سرحدوں کو چھو رہی ہے ۔ لوگ نواب اسد اللہ خان بہادر کی نسبت غالب شاعر سے زیادہ متعارف ہیں ۔ اگر نفسیاتی طور پر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غالب کی نوابیت افراسیابی خون اور اپنی انا کا شدید احساس ہی ہے جس نے غالب کو غالب بنایا ۔ یہ خودداری ۔ احساس کمال ۔ فنی برتری ۔ عزت نفس اور وضع داری جسے ہم غالب کی انانیت ، کہ سکتے ہیں جو ان کے کلام کے ہر شعر ، ہر مصرعے بلکہ ہر لفظ سے عیاں ہے ۔ ان کی مشکل پسندی ، جدت و اختراع ، روایت شکنی ، فعالی اور مثبت زاویہ نظر ، فلسفیانہ انداز فکر اور طنز و ظرافت کے مختلف روپ اسی انانیت سے جنم پاتے ہیں ۔

مرزا کی انانیت و خود پرستی ان کی خاندانی وجاہت "نسلی برتری اور طبقاتی بلندی کے شدید احساس کا نتیجہ ہے ۔ وہ خود کو سلجوق' سمر قندی اور ایبک ترک بتاتے ہیں ۔ والد فوجی عہدیدار تھے چچا کی زندگی بھی سپاہیانہ تھی ۔ مرزا ابھی چھوٹے سے تھے کہ والد اور چچا چل بسے ننہال والے خاصے

کھاتے پیتے رئیس تھے ۔ ان کا بچپن آگرے میں بڑے عیش و عشرت میں گذرا کنکوے اڑائے ۔ شطرنج کھیلی ۔ چوسر و گنجفہ کبوتر بازی اور عشق بازی تک لڑکپن میں لہو و لعب کے کسی شعبے میں بس نہ تھے ۔ بگڑے ہوئے امیر زادے کی رلگ رلیوں پر پہرہ بٹھا دیا گیا ۔ تیرہ برس کی عمر میں بیڑی پہنا دی گئی یعنی ریاست لوہارو کے نواب خاندان میں مرزا کی شادی ہو گئی ۔ چودہ برس کے کے تھے کہ آگرہ چھوڑ دہلی آ گئے ۔ یہاں کے حلقوں میں پذیرائی ہوئی ۔ شرفاء میں اٹھنا بیٹھنا رہا ۔ قلعہ معلیٰ سے تعلق قائم ہوا ۔ یہاں کی تہذیبی زندگی کا ان پر کافی اثر ہوا ۔ ہر بات میں اپنی وضع داری و خودداری کو برقرار رکھا ۔ دلی کالج کی پروفیسری پر اس لئے لات مار دی کہ نواب صاحب پالکی میں سوار ہو کر انٹرویو کے لئے گئے اور استقبال کے لئے پرنسپل صاحب حاضر نہ ہو سکے ۔ وبا میں اس لئے مرنا پسند نہ فرمایا کہ ,, دھنیے ۔ لورباف ۔ نائی ۔ قصائی سبھی مرے جا رہے تھے،، ۔ مکان کرائے کا تھا مگر اندر باہر بیس کے قریب شاگرد پیشہ متعین تھے ۔ رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے ۔ ذاتی آمدنی کا مستقل ذریعہ کوئی نہیں تھا ۔ پنشن بہت معمولی تھی ۔ فضول خرچی بلکہ شاہ خرچی کا یہ عالم تھا کہ قرض کی پیتے ، فاقہ مستی میں رہتے ، پر تمنا یہ تھی کہ جس شہر میں رہوں وہاں وئی بھی بھوکا نہ رہے ۔ منشی شیو نارائن کو لکھتے ہیں ۔

”نواب اسداللہ خاں لکھو یا مرز اسداللہ خاں ، بہادر کا لفظ دونوں حال میں واجب اور لازم ہے،، ۔ خود کو عرفی ، ظہوری اور نظیری کا ہم پلہ سمجھتے ۔ کسی کے قول کو سند نہ مانتے ۔ اسی انفرادیت پرستی کی وجہ سے قتیل کے متعلق ایسا ادبی قضیہ کھڑا کیا جو مرتے دم تک گلے کی پھانس بنا رہا ۔ ذوق کے جیتے جی شاہی دربار میں اتنے مقبول نہ ہو سکے ۔ قصائد میں بادشاہ کی اور اپنی تعریف کا پہلو نمایاں ہوتا ۔ دیکھئے اس کا اعتراف کتنے فخر سے فرماتے ہیں ۔

”قصائد کی تشبیب میں تو میں گرتا پڑتا ان نازک خیالوں اور بلندیوں تک پہنچ جاتا ہوں جہاں عرفی و انوری پہنچ جاتے ہیں مگر مدح و ستائش میں مجھ سے ان کا ساتھ نہیں دیا جاتا،، انہی نازک خیالوں اور بلندیوں تک پہنچنے کی

آرزو میں ابتدائی کلام چیستاں ہو کر رہ گیا اور طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں کے لئے قیامت بن گیا ۔ ہم عصر حریفوں کا ذوق نارسا پکار آٹھا

ع ,,مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے،،

مرزا بہت جھلائے ۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی
سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

ع خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

مگر حقیقت یہ ہے کہ مرزا کو صلے کی بھی ضرورت رہی اور ستائش کی تمنا بھی لامحدود تھی ان کا آبائی پیشہ سپہ گری سہی لیکن ان کو عزت صرف ان کی تحریروں سے ملی ہے ۔

وہ خود اپنے ,,نقش ہائے رنگ رنگ،، فارسی کلام میں ڈھونڈنے کو کہتے ہیں اور مجموعۂ اردو کو بے رنگ بتائیں لیکن یہ مسلم ہے کہ غالب کے اردو کلام نے ریختہ کو رشک فارسی بنا دیا ۔

مرزا کے کلام میں یہی احساس تفاخر انہیں متقدمین و معاصرین سے ممتاز کرتا ہے' ان کی انا (Ego) کو یہ بات ہرگز پسند نہ تھی کہ وہ آلام زمانہ کے سامنے ہتیار ڈال دیں ۔ غم عشق ۔ غم فراق غم مرگ اور سب سے بڑھ کر غم روزگار غرض کونسا غم تھا جس میں وہ مبتلا نہیں رہے ۔ چھوٹی عمر میں یتیم ہو جانا اور ,,اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے،، کے مصداق لڑکپن ہی میں ایسی شریک حیات کے ساتھ بندھ گئے جو ان کی ہم طبع نہ تھی ۔ مفلسی اور قرض کی مصیبت ۔ پنشن کا رونا ۔ حسب خواہش داد و ستائش سے محرومی ۔ سات عدد بچوں

کے والد بن کر بھی لا ولد رہے ۔ جوان بھائی کا دیوانہ ہو کر مر جانا ۔ عارف کی موت ۔ شہر دھلی کی تباھی اور احباب کی محبت سے دائمی جدائی بے شمار رنج و آلام تھے جن سے غالب نبرد آزما رھے لیکن نہ تو میر کی طرح ''روئیے یا رلایا'' کا طریقہ اختیار کیا اور نہ ھی فانی کی طرح احساس شکست و انفعالیت کو گلے لگایا ۔ ان کے کلام میں جوش و ولولہ ھے ۔ ان کا زاویہ نگاہ مثبت اور فعالی ھے وہ تحلیلی اور تجزیاتی ذھن (Analytical Mind) کے مالک ھیں ۔ اسی لئے اردو غزل کی جزباتی اور احساساتی فضاء میں ان کی فلسفیانہ تفکر اور نفسیاتی حقائق میں ڈوبی ھوئی تنہا اور منفرد آواز ہے ۔ ان کا طرز تقریر ایسا ہے جسے قاری سمجھتا ہے کہ ''گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' مثلاً یہ اشعار دیکھئے

عشرت قطرہ ھے دریا میں فنا ھو جانا
درد کا حد سے گزرنا ھے دوا ھو جانا

رنج سے خوگر ھوا انساں تو مٹ جاتا ھے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ھو گئیں

غم اگرچہ جانگسل ھے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ھوتا غم روزگار ھوتا

میری قسمت میں غم گر اتنے تھے
دل بھی یارب کئی دئے ھوتے

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ھے کس لئے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ھوں میں

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈرھم دم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ھو

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

ان آبلوں سے پاؤں کے گبھرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخئی فرشتہ ہماری جناب میں

مرزا نے دکھوں کا وار مسکراتے ہوئے برداشت کیا ۔ طنز و تشنیع کا ایسا حربہ استعمال کیا کہ درد دوا بن گیا ۔ ان کے کلام میں طنز و ظرافت کا ایسا شوخ و چہچہا رنگ نمایاں ہے جس کے پس منظر میں آلام زمانہ کا بحر بیکراں ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے ۔ ایسا تبسم زیر لب ہے جو گریہ ہائے بے قراری کی غمازی کرتا ہے ۔ مثلاً

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

میں نے کہا کہ بزم ناز غیر سے چاہئے تہی
سن کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

غالب کی انائیت انہیں روایت شکنی پر اکساتی ہے۔ وہ تخئیل اور طرز ادا دونوں میں اپنی علیحدہ راہ اختیار کرتے ہیں۔ تنگنائے غزل کے ظرف کے اندر رہ کر فارم کے سبھی تقاضے پورے کرتے ہوئے بھی وہ جدت پسندی۔ اختراع و ایجاد کی طرف گامزن رہتے ہیں وہ ہر قسم کے بتوں کو توڑتے رہتے ہیں۔ مسلمات متعارفہ کی تنقیص و تردید کرتے ہیں۔ افراسیابی خون انہیں مقلد اور معتقد نہیں بننے دیتا۔ تخیل کی ہر مسلم و منفرد حقیقت سے ٹکراؤ پیدا کرتے ہیں اس سے الجھتے ہیں۔ اس کی شہرت کمال و عظمت میں کوئی نہ کوئی رخنہ نکالتے ہیں۔ کبھی صاف صاف کبھی کنایتاً تنقیص کا رنگ پیدا کرتے ہیں اس سے ان کے احساس انفرادیت اور شعور یکتائی کو بڑا اطمینان حاصل ہوتا ہے اس سے قیس۔ کوہکن۔ منصور۔ خضر۔ کوئی بھی نہیں بچا۔ انہوں نے سب مسلمہ اوصاف کو ناقص قرار دیا ہے۔ منصور کی تنگ ظرفی۔ فرہاد کی خام کاری۔ قیس کی بے مصرف بیاباں نوردی اور خضر کی بے کار روپوشی غالب کے مضامین خاص ہیں۔ 'اعجاز مسیحا' اور 'اورنگ سلیماں' ان کے آگے ہیچ ہیں۔ ردیف ''مرے آگے'' والی ساری غزل اسی احساس تفوق سے مملو ہے۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

- - - - - - الخ

یا یہ اشعار دیکھیے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

لازم نہیں کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

داستانوی عشاق (خصوصاً کوہکن) کا حشر ملاحظہ ہو۔

مانع وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سر گشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

عشق و مزدوریٔ عشرت گہہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

غزل کی شاعری جس کا بنیادی عنصر حسن و عشق کا مضمون ہے ۔ غالب کی انانیت کی بدولت رسمی و روائتی باتوں سے ہٹ کر حقیقی اور واقعاتی رنگ اختیار کرتی نظر آتی ھے روائتی شاعری میں محبوب کو سفاک ۔ ظالم ۔ ستم پیشہ ۔ بے وفا ۔ تیر و تفنگ اور شمشیر و سناں سے لیس رقیب روسیاہ پر ہمیشہ مہربان اور عاشق کو وفادار ۔ مظلوم ۔ مجبور ۔ بے بس ۔ غم فراق کے بوجھ تلے نڈھال ۔ جدائی کے صدموں سے لاغر وغیرہ بندھے ٹکے انداز میں پیش کیا جاتا رہا ھے یا لکھنوی حضرات نے وصال محبوب کا ذکر کیا بھی تو نہایت نازیبا اور متبذل انداز میں کہ محبوب کا کردار کوٹھے کی طوائف اور بازاری عورت سے جا ملا ۔ وہاں کا عاشق ہرجائی اور ''تو نہیں اور سہی،، کے مسلک کا پابند ۔ معاملہ بندی کے مضامین بھی نہایت رکیک اور سوقیانہ طریقے پر پیش کیے گئے کہ اردو شاعری سے گھن آنے لگی ۔ غالب جیسی جینیس اور نابغہ شخصیت ھی ان گھسے پٹے خیالات میں نئی روح پھونک سکی ۔ ان کا تصور حسن و عشق نہ تو محض رسمی اور برائے شعر گفتن ہے اور نہ ھی ہرجائیانہ اور ہوس پرستانہ دکھائی دیتا ہے ۔ یہاں محبوب کے کردار میں بھی کافی تبدیلی واقع ہوئی ھے ۔ وہ ''بھولے سے سہی سینکڑوں وعدے وفا کر جاتا ھے،، عاشق بامراد وضع دار اور خود دار ھے جو محبوب کو عجز و نیاز کی بجائے حریفانہ اور جارحانہ طریقے سے راہ راست پر لا سکتا ہے ۔ یہاں عاشق نیاز مند نہیں بلکہ حسن اپنے ناز کے باوجود اپنے کیئے پر پشیمان ہے ۔ عاشق مخبوط الحواس یا جذبات اور احساسات سے مغلوب نہیں بلکہ نہایت زیرک اور ذہین و فطین ھے ۔ وہ نوحہ غم اور نغمہ شادی کو یکساں خیال کرتا ہے ۔ اس کے اندر فکر کی صحت مندی ہے اور غم سے نبرد آزمائی ، وہ حسن و عشق کی نفسیاتی کیفیات سے واقف ھے ۔

وہ حسب موقع جارحیت اور مردانگی کا ثبوت بھی دے جاتا ہے ۔ مثلاً میر، حسن کے ناز اور عشق کے نیاز کی مسلمہ کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں ۔

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں میر

غالب کے یہاں حسن پر عشق کو تفوق حاصل ہے یہاں نہ حافظ کی شیرینی اور سادگی و برجستگی ہے نہ میر کا سوز عجز و نیاز ہے

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچئے

اس سلسلے کی مزید مثالیں دیکھیے ۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں ؟ بزم میں وہ بلائے کیوں

وفا کیسی ، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

غلط ہے جذب دل کا شکوہ ، دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشا کش درمیاں کیوں ہو

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

تماشا کر اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

عاشق ہوں پر معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا مرے بعد

- - - الخ - - - مرے بعد

غالب کا محبوب ایک جاندار انسانی شخصیت ہے محض ایک حسین نقش نہیں غالب اس کی آب و گل میں فتنہ' شور قیامت دیکھتا ہے کیونکہ نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا ، وہ شوخ و شنگ - تنک مزاج - بیوفا - غیر منطقی سبھی کچھ ہے مگر خون آشام درندگی کے ان خصائص سے مبرا ہے جو شعرا کے روائتی معشوق میں خواہی نخواہی موجود ہوتے ہیں - اس کی انسانی صورت ہمیشہ قائم رہتی ہے - غالب کی اپنی افتاد طبع کے مطابق اس کا تصور حسن بھی حرکی ہے ساکن و جامد نہیں -

موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

چال جیسے کڑی کمان کا تیر ، ''لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ'' میں شاعر کی ذہنی کیفیت بالکل واضح ہے - کمال یہ ہے کہ غالب کو متحرک محبوب کے گرد و پیش کا پر سکون منظر بھی حرکت کرتا نظر آتا ہے -

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

معاملات حسن و عشق میں رشک کا مضمون جس انداز سے غالب نے باندھا ہے وہ کسی دوسرے اردو شاعر کے نصیب میں نہیں ۔ اس کی جڑیں بھی جذبہ خود پرستی و خود غرضی میں پیوست ہیں ۔ یہ رشک رقیب تک ہی محدود نہیں بلکہ خود معشوق اور اپنی ذات تک کو بھی اس میں شامل کر لیتے ہیں اور تو اور خداوند تعالی کو بھی سونپنے سے ہچکچاتے ہیں ۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

مرزا کے کلام میں ان کا احساس کمال جدت افکار اور جدت ادا کے کئی روپ اختیار کرتا ہے ۔ مذہبی ظاہر داری اور ریاکار ملائیت پر طنز اور چھیڑ چھاڑ روائتی شعرا کا خاص موضوع رہا ہے ۔ لیکن غالب نے حیات بعد مرگ اور جنت و دوزخ

کے تصورات اور مکافات عمل کے متعلق تقاضائے بشریت کو پورا کرتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے اپنے مخصوص انداز میں شاعرانہ شوخی اختیار کی ہے ۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تیری صورت مگر ملے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کیا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

جسمیں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کو کیا کرے کوئی

غرض مرزا کا یہی شوخ و بے باک لہجہ اور گرجدار آواز ہے جس نے اردو شاعری کی آبرو رکھ لی ہے۔ یہی جوش و طنطنہ خیالات میں اور ٹھاٹھ دار الفاظ و تراکیب کی در و بست ہے جس نے اقبال و فیض اور تمام نئی نسل کے شعرا کو متاثر کیا ہے اور آئندہ بھی مرزا کے کلام کو مقبولیت نصیب رہے گی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

بندگی میں بھی وہ آزادۂ خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں
روح القدس اگرچہ میرا ہم زباں نہیں

نامہ غالب بنام سید افسر حسین رضوی مدیر دبستان

میاں، تمہارے خط کا جواب منحصر دو باتوں پر ہے پہلی بات غالبیات کا پشتارہ جسے میں خرافات کا پلندہ سمجھتا ہوں ، پہنچ گیا ہے ۔ ''من صدائے شاعر فرد استم،، سہی لیکن یہ کس نے کہا تھا کہ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاؤ ۔ میں تو یہ کہنے کا گنہگار ہوں ۔

حرف حرفم در مذاق فتنہ جا خواہد گرفت
دستگاہ ناز شیخ و برہمن خواہد شدن

مگر یار لوگ ہیں کہ اسے پیش گوئی سمجھ پورا کرنے پر پل پڑے ۔ این مے از قحط خریداری کہن شد ، خوب شد مگر ارزانی چہ معنی دارد ؟ پھر تم کیا کسی سے ہیٹے ہو ۔ وقت سے فائدہ اٹھاؤ ۔ بھلا اس میں میرا بھی البتہ ہے ۔ تفصیل اس اجمال کی یہ کہ سر ورق پر میرا عکس ہو اور نام جلی حروف میں مع خطاب چھاپا جائے ۔ سنو میری جان ! نوابی کا مجھے خطاب ہے نجم‌الدولہ ۔ اور اطراف و جوانب کے امرا مجھ کو نواب لکھتے تھے بلکہ بعض انگریز بھی ، چنانچہ صاحب کمشنر بہادر دھلی نے جو ایک روبکاری بھیجی تھی تو لفافے پر 'نواب اسداللہ خاں، لکھا لیکن یاد رہے کہ نواب کے لفظ کے ساتھ مرزا یا میر نہیں لکھتے ۔ یہ خلاف دستور ہے یا نواب اسداللہ خاں، لکھو یا 'مرزا اسداللہ خاں، لکھو اور 'بہادر، کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے ۔

دوسری بات اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے کہ اس میں سے ایک جلد 'فرشتہ الہام، کو نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ اس کے 'جناب ملہم، کی نذر کروں گا ۔ پس لازم آتا ہے کہ اسی قصیدے کو جو مغفور ، بہادر شاہ

ظفر کی مدح میں تھا اور بعد میں حضرت ملکہ معظمہ انگلستان کو بھیجا گیا ، تم نئے مرے سے ترتیب دو ۔ خواہ گریز میں ترمیم کرو یا کوئی مصرع بدلو مگر تشبیب اور مدح کے ان اشعار سے کوئی تعرض نہ کیا جاوے جن میں ممدوح کا نام نہیں آتا۔ اجمال اس تفصیل کی یہ کہ کم سے کم مصرعے بدلے جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ واضح رہے کہ گفتہ غالب میں پیوند لگانا اور بات ہے اس کی الٹی سیدھی شرحیں چھپوانا یا کالج کے بچوں کو بہلانا اور بات ۔ حاشا ثم حاشا مطلب میرا یہ نہیں کہ قابلیت تمہاری معرض شک میں آوے اور گلدستہ ذہانت مرجھاوے ۔ روئے سخن تو دیکھو کس طرف ہے ؟ بھلا تم دل میلا کیوں کرو ، بھائی ! تو سید زادہ اور میں ترا دلدادہ۔ ہاں صاحب ایک بات اور ہے اور وہ محل غور ہے ۔ جب مجلہ چھپ چکے تو یہ قصیدہ چھپ جائے ۔ دو باتیں ہیں ، ایک تو یہ کہ چھپے بعد مجلے کے اور لگایا جائے پہلے مجلہ سے ۔ دوسری یہ کہ اس کی سیاہ قلم کی لوح الگ ہو ۔ اگر مہرہ اگر ہو جائے گا تو حرف خوب چمک جائیں گے ۔ اور پہلے صفحے پر جس طرح مجلہ کا نام چھاپتے ہیں اسی طرح یہ بھی چھاپا جائے کہ ”قصیدہ در مدح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔“ میرا نام کچھ ضرور نہیں ۔ للہ الحمد ۔ شہرت مجھے منظور نہیں ۔ ہاں البتہ مجلہ کے صفحے پر تو ہوگا ۔ اب اچھی طرح سمجھ لو کہ اس کا طور کیا ہوگا اور صاحبان مطبع کو اس کا انطباع کیوں نا مطبوع ہوگا ۔ چاہتا ہوں کہ یہ مجلہ میری ترقی درجات میں کام آوے اس واسطے کہ قدسیوں میں چہ میگوئیاں ہیں ۔ کسی دوسرے طبقہ جنت میں بھیجے جانے کا سنا ہے تمہاری تصدیع باعث ہوگی تمہارے شہرہ و قبول کا اور عاقبت سنورے گی غالب مغلوب کی ۔

جی تو چاہتا ہے کہ خود بھی اس کے لکھنے والوں میں نام لکھواؤں مگر فیضی سا یار جانی کہاں سے پاؤں ۔ رشک آتا ہے تمہاری قسمت پر کہ ایسا ”قلم برگوش“ معاون پایا ۔ خدا گواہ کہ باجوہ کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں بس اس کے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے مگر وہ ایسا کہاں وہ کیوں میرا یہ کام کرنے لگا ۔ اس سے کہو مرد خدا ، تو بھی تو یکے از مشکلکشایان دبستان ہے ۔ میں شحنہ شہر نہ سہی ، سپاہی زادہ تو ہوں ۔ زبدۃالعلماء نے کہو اسلاف کا تیر شکستہ بصورت قلم

تو رکھتا ھوں ۔ میری طرف سے چند سطریں میرے حال کے موافق اور بشریت کے تقاضے کے تحت بطور ایک پیغام کے لکھے اور چھاپ دے ۔ میرے دستخط خاص کی نہ حاجت ہے نہ اہمیت ۔ ''از غالب نگاشتہ و رواں داشتہ،، کون احمق نہ سمجھے گا۔ اگر اس کی طبیعت غیر حاضر اور میر منشی غیر موجود ھوں تو کہنا از جانب غالب اتنا ھی پیغام لکھ دے۔

کیا زھد کو مانوں کہ نہ ھو گر چہ ریائی
پاداش عمل کی طمع خام بہت ھے

برخوردار کامگار ، تم کہ افسر فرق ادب ھو ۔ ھزار رنج اٹھاتے ھو اور کڑیاں جھیلتے ھوکہ غالب مرحوم کی صد سالہ برسی تزک و احتشام سے منائی جائے ۔ بادشاہ وقت نہیں کہ کسی شایاں شان خطاب سے نوازوں ۔ رئیس زادہ ھوں مگر مقدرت نہیں کہ خلعت و وظیفہ مقرر کر دوں جاگیر دار نہیں کہ ایک مربع اراضی ھی دے دوں۔ حافظ ھوتا تو غالب کو اپنا غیر جانتا اور پہلے سے پڑھے ھوئے پانچ قرآن تمہاری طرف سے اس کی روح کو بخشتا حاجی ھوتا تو تمہیں حج کا ثواب نذر کرتا ۔ ھاں اتنا ھے کہ تم میری نظروں میں آ گئے ھو ۔ جوھر قابل ھو ۔ اگر اپنے کام سے کام رکھو گے اور یہ دلنشیں کر لو گے کہ ''رموز مملکت خویش خسرواں دانند،، تو تمہارے دیوان کا دیباچہ لکھدوں گا یعنی چند سطریں تمہارے حق میں واسطے تمہاری دلجوئی کے نہ کہ اشک شوئی کے ، تا کہ سند رھے اور بوقت ضرورت کام آوے ۔

کاغذ نبڑ گیا ورنہ تمہارے دل کی خوشی کے واسطے ابھی اور لکھتا۔ اپنے بڑے بھائی صاحب کو میرا سلام باعتبار محبت کے اور بندگی باعتبار سیادت کے اور دعا باعتبار یگانگی اور استادی کے کہنا اور کہنا کہ آدمی بنا چاھے تو زبان و ادب کی تحصیل و تدریس میں کیا دھرا ھے ؟ جو علم سخن سازی اور فن مصاحبت سے شناسا نہ ھوا حیف کہ عمر عزیز کا اس نے مزا نہ پایا واحسرتا کہ نظرکرم میں نہ سمایا ۔ اللہ بس ماسوا ھوس۔

غالب ۔ نگاشتہ سہ شنبہ، ھشتم ربیع‌الثانی ۱۳۸۹ھ وقت رسیدن نامہ

" اسد اللہ خان تمام ہوا "

(مرگ غالب کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی)

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
اقبال

باغ بہشت سے باہر قدم رکھتے ہی موت انسان کے لئے ایک پیچیدہ مسئلہ بن گئی ۔ قابیل بیچارا تو یہ بھی نہ سمجھ پایا کہ وہ اپنے بھائی ھابیل کے مردہ جسم کے ساتھ کیا سلوک کرے وہ اس نعش کو گٹھری بنا پیٹھ پر لادے لادے پھرتا رہا آخر ایک کوے نے اسے یہ بات سمجھائی کہ لعشوں کو زمین میں دفن کر دینے سے کسی قدر اس بوجھ سے سبکدوشی ہو سکتی ہے ۔ لیکن بات یہاں تک ہی ختم نہیں ہو جاتی کہ مٹی کا پتلا مٹی میں مل کر مٹی ہو گیا اور بس ۔ یونانیوں نے اس کے لئے دیوتاؤں (Gods) کی دنیا آباد کی اور اس طرح کافی عرصہ تک یونانی مائیتھالوجی کا چرچا رہا ۔ فراعنہ مصر نے مردہ لعشوں کو ممیانے (حنوط کرنے) کا فن ایجاد کیا تاکہ موت سے بچکر بقائے دوام حاصل ہو سکے ۔ اللہ میاں نے جب یہ دیکھا کہ انسان بیچارا موت سے بہت زیادہ پریشان ہے تو انہوں نے انسان کی اس نفسیاتی کمزوری کے پیش نظر عذاب قبر اور عذاب جہنم کے درد ناک پہلو بیان فرما کر اسے خوب ڈرایا دھمکایا اور ساتھ شراب طہور ، حور و غلمان اور باغ بہشت میں دوبارہ واپسی کا لالچ بھی دیا ۔ مزید یہ بھی فرما دیا کہ " میری راہ میں جان دینے والے کبھی نہیں مرتے ۔ انہیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں ' کھاتے ہیں - پیتے ہیں ۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ تم انکی زندگی سے بے خبر ہو ،، شیکسپیر کے زمانے تک کے لوگ تو مردہ انسانوں

کی روحوں کے ساتھ ہمکلامی کا شرف بھی حاصل کرتے رہے ۔ یہ روحیں (Ghosts) کہلاتیں اور باقاعدہ انسانی محفلوں میں آن کر آٹھتی بیٹھتی تھیں ۔ ہندوؤں نے تناسخ اور آواکون کا نظریہ ایجاد کرکے اس مسئلے کو اور بھی الجھا دیا ۔ بہر صورت سائنس والے بھی اتنی بات تو مانتے ہی ہیں کہ مادہ کبھی فنا نہیں ہوتا صرف مختلف روپ دھارتا رہتا ہے ۔

خیر جتنے منہ آتنی باتیں ۔ لیکن بھلا ہو مشرقی شعراء کا ۔ انہوں نے اس معمے کو چشم زدن میں حل کر دیا ۔ صوفیا تو عشق الہی میں اپنے نفس کو مارنے کے سامان کرتے رہتے ہیں تاکہ جزو بہت جلد کل میں مدغم ہو جائے مگر ہمارے شاعر حضرات بھی 'کسی' پر ایسے مرتے ہیں کہ مر کر ہی چین پاتے ہیں ان کا محبوب ہمیشہ مسلح ہوتا ہے ۔ نگاہ کے تیر ۔ ابروؤں کی کمانیں پلکوں کی انیاں اور عشوہ۔ غمزہ و کرشمہ کے خنجر استعمال کرتا ہے ۔ وہ اس ایٹمی دور میں بھی جدید ہتھیار تو کیا بندوق اور پستل سے بھی ہرگز کام نہیں لیتا ۔ لہذا یہ لوگ اس میٹھی مزت کو ترجیح دیتے ہیں ۔ موت کے بعد جو شعر کہتے ہیں ان کے مطالعہ سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حیات بعد ممات تو نہایت دلفریب ہے ۔ یہ لوگ قبروں میں ، جنت میں ، عالم ارواح میں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں بڑی مشاعرے اور غزل سرائی کی رسم کو نہایت وضع داری سے نبھائے چلے جاتے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں کہ یہ لوگ موت کے بعد کتنے مزے میں ہیں ۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

موت ہے زندگی کا اک وقفہ
پھر چلیں گے ذرا سا دم لے کر
(میر)

گئے سختی کے دن ، سوئے لحد میں پاؤں پھیلا کر
یہ راحت بعد مردن زندگانی بھر سے بہتر ہے
(صغیر)

بڑے چین سے قبر میں سو رہا ہوں میں
نیا آسمان ہے نرالی زمیں ہے
(آغا شاعر)

دن کو اک نور برستا ہے میری تربت پر
رات کو چادر مہتاب تنی ہوتی ہے
(حفیظ جونپوری)

طالب مرگ ہو ، خواہاں ہے اگر راحت کا
گوشہ امن کوئی اور بجز گور نہیں
(رند)

موت کے آتے ہی ہم کو خود بخود نیند آ گئی
کیا اسی کی یاد میں کرتے تھے شب بیداریاں
(آتش)

آدمی کو موت کے آنے کی لازم ہے خوشی
عید ہے جس روز چھٹکارا ہوا محبوس کا
(آتش)

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی
(اقبال)

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا ہے
(غالب)

یہ قصہ بہت طولانی ہے اگر ایسے اشعار کی ایک زنجیر بنائی جائے جو شعرا نے مرنے کی خوشی میں کہے ہیں تو یہ زنجیر چاند تک پہنچ جائے ۔ آج ہم صرف اردو کے عظیم شاعر حضرت اسد اللہ خاں غالب کی موت کی کہانی کچھ اُن کی کچھ اپنی زبانی بیان کرنا چاہتے ہیں ۔ جو سبق آموز تو شائد ہی ہو مگر دلچسپ ضرور ہے ۔

یہ تو مسلمہ امر ہے کہ غالب بڑے عجیب و غریب شاعر تھے ۔ اُن کی ہر بات نرالی اور اچھوتی تھی ۔ ندرت اور طرفگی اُن کا سرمایہ افتخار تھا ۔ عجز و نیاز سے محبوب راہ پر نہ آتا تو اُسکے دامن کو حریفانہ طور پر کھینچنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے ۔ کبھی کبھی ایسا وقت بھی آ جاتا کہ محبوب تک رسائی تو کجا اُس کے در پر پڑے رہنے اور درباں کے قدموں میں سر رکھ دینے کو کار ثواب سمجھتے تھے ۔ لیکن اُن کا محبوب بھی ایسا سنگدل اور جفا جو ثابت ہوا کہ یہ بیچارے اپنا کفن اور تلوار تک ساتھ لے کر جاتے مگر وہ کوئی نہ کوئی عذر ہمیشہ گھڑ لیتا ۔ کیونکہ وہ انہیں قتل کرکے مفت میں اُن کی عزت افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا ۔ وہ اس غریب کو بھری بزم سے نہایت ستم ظریفی کے ساتھ اُٹھا دیا کرتا تھا ۔ آخر جب آپ نے شہادت پائی تو اپنا قتل محبوب کے سر منڈھ دیا وہ اتنا پشیمان ہوا کہ آئندہ کے لئے ظلم و ستم ہی سے توبہ کر لی کم بخت ریڈیو اور ٹی وی والوں نے اس خبر کو بہت اچھالا ۔ میت کے سرہانے ، فلپ کا ٹرانسسٹر ، دھرا تھا ۔ جب انہوں نے محبوب کی توبہ کی خبر سنی تو بستر مرگ پر ہی فریاد کرنے لگے ۔

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غالب کے احباب نے آن کی یہ آہ و زاری سنی تو آن سے نہ رہا گیا ۔ ایک ٹیکسی لی اور محبوب کے در دولت پہ جا دھمکے ۔ کوٹھی کے دربان ,, خان بابا ،، کو ایک ڈبیا نسوار بطور رشوت پیش کرکے باریابی حاصل کی ۔ محبوب ابھی بستر استراحت پر ہی تھا اور غسل کا ارادہ کر رہا تھا ۔ ناگاہ ان لوگوں کو دیکھ کر گبھرا سا گیا ۔ بڑی منت و سماجت کرکے آخر یہ لوگ اسے کھینچ کھانچ کر میت کے پاس لے ہی آئے ۔ غالب صاحب نے محبوب کو ، سلیپنگ سوٹ میں ، زلف سیاہ رخ پہ پریشان کئے ہوئے ، اپنے سرہانے پایا۔تو برجستہ کہا ۔

منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے آسے بالیں پہ مرے ، پر کس وقت

مومن نے ایسے ہی موقع پر کہا تھا ۔

وہ آئے ہیں پشیمان لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

لہذا موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غالب نے مزید کہا ۔

منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

محبوب نے ذرا چھیڑ چھاڑ کی کہ ۔

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں ، وہ جوانی کدھر گئی

غالب نے جواب دیا ۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے ، چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ایسی ھی چھیڑ چھاڑ جاری تھی کہ زنان خانے سے رونے کی آواز آئی محبوب نے تسلی دینے کے لئے کہا:-

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ھیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ھائے ھائے کیوں

اس پر ''بی وفادار،، ''اور،، میم صاحبہ ، چراغ پا ھو گئیں اور دروازے پر آ کر کہنے لگئیں '' کلموھی تیرے تو دیدوں کا پانی بھی بہ گیا ہے ،،

غالب نے بات کاٹ دی اور رفع شر کے واسطے فرمایا ۔

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ھم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ھو گئیں

محبوب نے بڑی نخوت سے کہا ''ھم حور تھوڑی ھیں،،

غالب نے پھر شوخی دکھائی ۔

میں جو کہتا ھوں ھم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ھیں کہ ھم حور نہیں

پھر ذرا رندھے ھوئے گلے سے آواز نکالی کہ ۔

نہ ھوئی گر میرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ھوں تو یہ بھی نہ سہی

اسی اثناء میں مفتی صدرالدین آزردہ اپنی پندرہ فٹ لمبی کار ، سمیت پہنچ گئے اور غالب کی میت کو دیکھ کربے اختیار نعرہ لگایا ۔

,,اسد اللہ خاں تمام ھوا
اے دریغا ! وہ رند شاھد باز،،

غالب نے بھی بڑی حسرت سے کہا ۔

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لئے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

اس کے بعد ذرا محبوب کی طرف منہ پھیر کے طنزاً فرمایا ۔

زندگی میں تو وہ محفل سے آٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مرگئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ تھا کہ ۔

میں نے کہا کہ بزم ناز غیر سے چاہئے تہی
سن کر ستم ظریف نے مجھ کو آٹھا دیا کہ یوں

ایسی درد بھری باتیں سن کر محبوب کا دل پسیج گیا اور لگا دعائیں مانگنے کہ پروردگار اس مظلوم کی مغفرت فرما اور جنت الفردوس میں جگہ دے ۔

غالب کی رگ شرارت و شوخی پھڑک آٹھی فرمایا ۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہو گی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

محبوب نے کہا ,,حضرت اب اللہ اللہ کیجئے ۔ جنت بڑی فضا کی جگہ ہے ۔ وہاں دل لگی او دل بستگی کا کافی سامان موجود ہے ۔ آپ کو یقیناً وہاں راحت و تسکین مل جائے گی ،،

غالب نے مکھن لگایا ۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تیری جلوہ گاہ ہو

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تری صورت مگر ملے

محبوب اپنی اپنی تعریفیں سن کر پھولے نہ سماتا تھا ۔ نہایت متفخرانہ انداز میں کہنے لگا "ہم آپ کا ایک عالیشان مزار اپنی کوٹھی کے عین مقابل ، سنگ مرمر سے تعیر کروائیں گے ،، اس بات سے میت کے منہ پر اداسی سی چھا گئی ۔ کیونکہ اُن کے جذبہ رشک کو اکسا دیا گیا تھا ۔ التجا کی کہ ۔

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

جب تابوت وغیرہ تیار ہونے لگا ۔ تو غالب وصیت کرنے لگے ۔

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاںدادۂ ہوائے سررہگزار تھا

محبوب نے دریافت کیا حضرت ! آپ کا قتل اب کس کے ذمے ہو گا ؟ کم از کم مجھے تو معاف فرما دیا ہو گا "فرمایا،،

عشق میں بیداد رشک غیر نے مارا مجھے
کشتہ دشمن ہوں آخر ، گرچہ تھا بیمار دوست

محبوب نے اپنا پنڈ چھڑانا چاھا کہ "اب مجھے تو اجازت بخشئے تا کہ جا کر نہا دھولوں اور باوضو ہو کر آپ کے جنازہ میں شرکت کروں،، غالب نے آخری وار کیا ۔

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

مولوی فضل حق خیرآبادی غالب کی موت کی خبر سنتے ہی دوڑے دوڑے آئے اور یہ دیکھ کر افسوس کیا کہ ابھی تک لاش کو کفنایا تک نہیں گیا کہنے لگے -

یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

غالب نے جواب دیا -

مجھ کو دیار غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

چونکہ بحث و تکرار اور چھیڑ چھاڑ میں کافی وقت گذر چکا تھا اور میت کو دفنانے میں دیر کرنا از روئے شریعت بھی روا نہیں لہذا لالہ جی مہاراج کی دوکان سے کفن کا کپڑا آدھار لایا گیا - غسل فرما کر جب حضرت نے سفید پوشاک زیب تن کی تو کہا -

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

اب احباب نے اسرار کیا کہ جاتے سمے ایک محفل مشاعرہ ضرور منعقد ہونی چاہئے - چنانچہ دیوان خانے میں سب شعراء نے مرثیوں قصیدوں اور غزلوں کا دور چلایا - جب مرزا اسد اللہ خاں غالب کا نام نامی پکارا گیا تو مائیک کے سامنے " ٹیپ ریکارڈ "، رکھ دیا گیا اور مرزا کی یہ ٹیپ شدہ غزل سامعین کو بڑی دیر تک رلاتی اور تڑپاتی رہی ۔

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی بھی قابل نہ رہا
ہوئی معزولئی انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلہ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

درخور عرض نہیں جوہر بیداد کوجا
نگہ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسئی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

غزل کے دوران مکرر کہنے داد یا بے داد کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لہذا اختتام پر شعراء نے مرزا کے مصرعے گنگنانے شروع کر دئے اور واہ واہ کا وہ شور ہوا کہ الاماں ۔

آخر جنازہ اٹھا تو کلمہ شہادت کی جگہ عقیدت مند مرزا کے اشعار ہی آواز بلند پڑھتے تھے ۔ اور دور تک لوگ دکانیں بند کرکے میت کو کندھا دینے آتے اور مرزا کا ایک شعر ذرا ترنم سے پڑھ دیتے ۔ اس طرح کے رویے سے مرزا بہت تلملائے اور کہا ۔

ہوئے مرکے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

لاکھوں افراد نے جنازے کی نماز میں شرکت کی ۔ جونہی لحد میں اتارنے کا مرحلہ پیش آیا اور میت کا رخ قبلہ کی طرف کیا تو خود بخود محبوب کی جانب پھر گیا ۔ چنانچہ محبوب کو قبلہ کی طرف کھڑا کر دیا گیا تو یہ بلا ٹلی لیکن ساتھ ساتھ مرزا کے پائے مبارک برابر حرکت کر رہے تھے شاید آپ بھاگ نکلنے کی سوچ رہے ہوں اور زبان پر یہ شعر جاری تھا ۔

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

میت کے ساتھ ایک گلاب کی ٹہنی رکھ دی گئی ۔ کچھ لوگوں نے الوداع کہتے ہوئے گلدستے بھی پیش کئے تو مرزا نے شکریہ ادا کیا کہ ۔

بسکہ ہم ہیں اک بہار ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

علائی صاحب نے مزاج پرسی کی تو فرمایا ۔

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے مری گور کے اندر کھلا

اور پھر ذرا محبوب سے یوں رخصت چاہی کہ ۔

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

معتبر ذرائع سے خبر ملی ہے کہ جب مرزا کو فرشتے پکڑ دھکڑ کر اللہ تعالیٰ کے حضور لے گئے تو ان کے اعمال کا کچا چٹھا یوں پیش کیا کہ انہوں نے اپنی

۷۳ سالہ زندگی میں کوئی چالیس من دیسی اور پچاس ٹن ولایتی شراب کا ستیاناس کیا سینکڑوں ہزاروں سے قرض لیا اور کسی کو ایک پائی تک بھی نہیں لوٹائی ۔ داڑھی محض فیشن کے طور پر رکھتے تھے اور اس میں بھی جدت یہ کی کہ سرمنڈا ڈالا عبادت کا یہ عالم ہے کہ ایک دفعہ نماز کی نیت ہی باندھی تھی کہ کہیں سے شراب کی بوتل آ گئی تو فوراً نماز چھوڑ دی اور مصلے سے اتر شغل مے نوشی مین لگ گئے ۔ چشم دید گواہی کے لئے ساقی اور اقرار جرم کے لئے ان کا دیوان بھی پیش کیا جا سکتا ہے مثلاً ۔

پلا دے آوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئیے

اس طرح کی بیشتر مثالیں ان کے کلام سے داخلی شہادت کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں ،،

غالب معترض ہوئے کہ جناب والا قرآن پاک جو آپ ہی کا کلام ہے ہمارے کلام کی نفی کرتا ہے ۔ یقولون ما یفعلون ۔ یعنی شاعر لوگ جو کچھ کہتے ہیں. کرتے نہیں ، لہذا فرد جرم عائد نہیں ہوتی اللہ میاں نے فرمایا ۔ ”لیکن ان فرشتوں کی شہادت اور تمہارے اعمالنامے کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے،، مرزا نے بڑی شوخی سے عرض کیا ۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

اللہ میاں نے فرمایا ''اگر یہ بات ہے تو چلو تم اپنے گناہوں کا حساب کتاب خود ہی بتا دو،، مرزا نے رو کر عرض کی ۔

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

خداوند تعالیٰ نے مسکرا کر فرمایا کہ عجیب حیوان ظریف ہے کہ اپنے گناہ کا نہ خود اقرار کرتا ہے ۔ اور نہ فرشتوں پر ہی اعتبار کرتا ہے ۔ لیکن مرزا یاد رکھو اس طرح تم سزا سے ہرگز بچ نہیں سکتے،، غالب نے پھر عرض کی ۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اللہ میاں فرمانے لگے کہ سزا کے بعد تمہیں بہشت میں ضرور بھیجا جائے گا اس پر غالب صاحب نے فرمایا ۔

وہ چیز جس کے لئےہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام و مشک بو کیا ہے

پھر کہا ۔

دیتے ہیں جنت حیات دھر کے بدلے نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

بعد کے واقعات میں ہمارے بہشت اور دوزخ کے نامہ نگاروں میں اختلاف رائے موجود ہے ۔ البتہ ''ڈائریکٹ ڈائیلنگ،، سے محبوب کو غالب کا یہ پیغام 'فون، پر ضرور مل گیا ہے،،

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

نوٹ ۔ قارئین کو ان واقعات کی صداقت میں شک و شبہ کی کھلی اجازت ہے ۔

غیب کے مضامین

غیب کے مضامین ہوتے بھی ہیں یا نہیں ایک غیر فیصل سوال ہے لیکن غالب کا دعویٰ یہی ہے :

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

یہ پوری کی پوری غزل اور اسکے قطعہ بند اشعار کو پڑھ کر پہلے تاثر میں غالب کے دعوے پر ایمان لانا پڑتا ہے ۔ لیکن یہ جادو اس لئے کام کر جاتا ہے کہ غالب کی شاعری عظیم شاعری ہے اور ہر عظیم شاعری کا کام بقول کو لرج اپنی سحر آگیں کیفیت سے شک کو معطل کر دینا ہے ۔ غالب نے خود ہی اپنے الفاظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم قرار دیا ہے ۔ الفاظ کے اس طلسم میں اتر کر دیکھیں یا شعر کے مفہوم سے قریب ہوتے ہوئے اس طلسم کے ذریعہ معنی کے خزانے کا دروازہ کھول کر دیکھیں تو اعلیٰ افکار کے ہیرے جواہرات وہی ہیں جو مدت سے انسانی ذہن کے خزانے کا سرمایہ رہے ہیں ۔ یہ جواہر الوہیت کے تخت و تاج سے پائے ہوئے نگینے نہیں ہیں اور اگر ہیں تو تخلیق آدم سے انسانی ذہن ہی میں ڈھلتے رہے ہیں ، غیب سے نہیں آئے البتہ انکی تراش خراش بالکل نئی ہے ۔ یہ نیا پن ، غالب ہی کے الفاظ میں ، دوسرے سخنوروں سے مختلف اور اچھوتے انداز بیان کا ہے نہ کہ غیب کے مضامین کا ۔

اگر مضامین سے مراد افکار لی جائے تو یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ تمام کا تمام انسانی علم اکتسابی ہے ۔ علم لدنی یا وہ وحیٔ الٰہی(۱) جو پیغمبروں کا شرف ہے عام انسانوں کے لئے نہیں ۔ انسانی ذہن کتنا ہی دراک اور قوی کیوں نہ ہو کسی ایسی چیز کے ادراک سے قاصر ہے جو احساس و حواس کی گرفت سے باہر ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا تخیل ، تصور یا ادراک کسی انسان کے بس کی بات نہیں ۔ انسانی علم صدیوں کے مشاہدات و تجربات کا رہین منت ہے البتہ انسان میں استنباط کی قوت ایسی ہے جو فرشتوں سمیت کسی اور مخلوق میں موجود نہیں ۔ اسی قوت کے ذریعے عقل، معلوم سے نا معلوم اور محسوس سے غیر محسوس تک رسائی حاصل کرتی ہے ۔ ظاہر ہے اس علم کا غیب سے رشتہ جوڑنا صحیح نہیں ۔ انھیں دقتوں کے پیش نظر کہتے ہیں کہ بڑے شاعر کا کام نئے افکار کا پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ بقول پوپ انھیں چیزوں کا اظہار ہے جو اکثر دھرائی گئی ہیں مگر اتنے اچھے طریقے سے ادا نہیں ہو پائیں ۔

' مضامین ' کے معنی اگر موضوع کے بجائے موضوع کے ضمن میں آنے والی باتوں کے لئے جائیں تو غالب کی بات درست ہو جاتی ہے ۔ غالب نے مضامین کی مناسبت سے ' خیال ' کا لفظ بھی ایسا چن کے رکھا ہے جو بلاغت اور ذو معنویت کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے ۔ اگر ' خیال ' کے بجائے ' دماغ ' کا لفظ ہوتا تو پھر ' مضمون ' کے معنی خیالات کے ہو جاتے اور شعر کا ایک پہلو یہ نکلتا کہ دماغ میں آنے والے خیالات غیب سے اترتے ہیں ، یہاں کی چیزیں نہیں ہیں ۔ اسکے برعکس الفاظ کے موجودہ انتخاب سے مصرعے کے یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ نئے نئے مضمون یا خیال کی نئی نئی مناسبتیں ایک دم سے تصور میں ابھر رہی ہیں ، لاشعوری طور پر خیال کے مختلف گوشوں کو نئے نئے پیرایہ ہائے اظہار مل

(۱) وہ وحی جو شہد کی مکھی کو خدا کی طرف سے ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ خوبصورت اقلید سی گھر بناتی اور ایک خاص نظام حیات پر چلتی ہے' فکر سے متعلق نہیں ہے ۔

رہے ھیں - یعنی ایک خیال کے تمام ضمنی مضامین نئی بندشوں ، نئی مناسبتوں اور نئے اسلوبوں میں ڈھل رہے ھیں گویا خیال تو وھی پرانا ھے مگر تشبیہیں نئی ھیں ، استعارے نرالے ھیں ، تراکیب انوکھی ھیں ، بات کہنے کے ڈھنگ میں ندرت ھے -

تمام اشیائے تشبیہہ ھمیشہ سے اسی مادی دنیا کا سرمایہ ھیں اور پاکیزہ خیال بھی اللہ کی طرف سے شاعر کو الہام کیا ہوا کوئی ایسا مضمون نہیں ھے جو انی اعلم و ما لا تعلمون (جو میں جانتا ھوں وہ تم نہیں جانتے) کے مصداق خالق کے سوا کسی کے علم میں کبھی نہ رہا ھو - نہیں ایسا نہیں ھے - ھر خیال انسانی ذھن کی اپنی ھی تخلیق ہے - شاعر کے ذھن سے الہام کا یہ تعلق ضرور ھے کہ اس کے ذریعہ خیال کے اظہار کے لئے وہ انوکھی مناسبتیں سوجھ جاتی ھیں جن سے خیال کو زندگی اور ابلاغ کو تاثیر مل جاتی ھے - مثلاً چکنی ڈلی کے لئے غالب کو فی‌الفور کیا کیا صورت آفریں مناسبتیں سوجھی ھین - چکنی ڈلی میں ایکدم مہر مکتوب ، مہر نماز ، خشت خم صہبا اور سر پستان پری زاد کی مشابہتیں ڈھونڈنا الہامی ملکہ سے متعلق ھے - باتیں یہیں کی ھیں ، تلاش الہامی ھے -

اسی طرح وہ قطعہ ھے جسکے مقطع میں غالب کو غیب کے مضامین کا دعویٰ ھے - اس میں بھی ایک ازل کے برابر پرانے خیال کو کیسی کیسی عبرت خیز و فکر انگیز تصویریں غالب نے عطا کی ھیں - گوشۂ بساط کو دامان باغبان اور کف گل فروش ، خرام ساقی کو جنت نگاہ اور صدائے چنگ کو فردوس گوش ٹھہرانے میں تصور کی کارفرمائی الہامی ھے لیکن موضوع کے معنی میں نہ مضمون الہامی ھے نہ تشبیہیں اور استعارے - باتیں یہیں کی ھیں ، تلاش الہامی ہے ، مناسبتوں اور مشابہتوں تک رسائی الہامی ھے - میں بھی غالب کو الہامی شاعر مانتا ھوں مگر غیب کے مضامین کی بنا پر نہیں ، ذھن رسا کی بنا پر -

"غالب کی نظم و نثر میں مزاحیہ عناصر"

انسانی زندگی میں مزاح اور اس کی اہمیت کے متعلق مختلف نظریات ملتے ہیں ۔ فارسی میں مزاح یا ظرافت کے معنی دانائی اور خوش طبعی کے ہیں ۔ اور اردو میں یہ لفظ بڑے وسیع معنی رکھتا ہے ۔ ایک مغربی مفکر اسٹیفن لی کوک نے مزاح کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ زندگی کی ناھمواریوں کے اس ھمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ اظہار ہو جائے ۔

غالب کی پوری زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی شخصیت ایک ایسے دور کی پیداوار تھی جس میں زندگی نے اپنے تضاد سے ایک مزاح کی صورت اختیار کر لی تھی ۔ انہوں نے آخری مغل بادشاہ کے دربار کی شان و شوکت اور دلی کے کوچوں کو اوراق مصور کی شکل میں بھی دیکھا ۔ اور ان ھی آنکھوں نے اپنی گلی کوچوں میں مسلمانوں کی چار سو سال کی تہذیب کو دم توڑتے ہوئے بھی دیکھا ۔ ایک مرتبہ انہوں نے دربار کی ملازمت کو اپنی خوداری کے آگے ٹھکرا دیا اور پھر زندگی گزارنے کے لیے دوبارہ اس خدمت کو قبول بھی کیا ۔ اسی طرح انہوں نے انگریزوں کی ملازمت کو بھی ٹھکرایا اور بعد میں انگریزی حکومت کی خدمت میں پنشن کی درخواستیں پیش کیں ۔

ان کی خودی اور ضروریات زندگی اکثر جگہ ٹکراتی ہوئی نظر آتی ہیں ۔ زندگی کی انہی نا ھمواریوں کے ھمدردانہ شعور نے ان کی شاعری اور خطوط میں فنکارانہ اظہار کی صورت اختیار کرکے طنز کی شکل اختیار کی ۔ وہ حقیقتوں سے متعارف کراتے ہیں ۔ لیکن ہونٹوں کے کونوں سے مسکراہٹ بھی پھوٹی پڑتی ہے ۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

قطع کیجیئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

غالب کی عظمت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے کائنات کی سنجیدگی اور اس کی تلخ حقیقتوں کو خندہ پیشانی سے قبول کیا ۔

ایک اچھے مزاح نگار کو فطرت کی طرف سے بلند ذوق مزاح اور نگاہ دوربین عطا ہوتی ہے جو ایک بہترین فنکار کی مانند زندگی کے وسیع مطالعے میں اس کی مددگار ثابت ہوتی ہے ۔ اور زندگی سے ایسے واقعات منتخب کرتی ہے جو اس کے فن کے لیے انتہائی موزوں ہوں ۔ ایک مزاح نگار زندگی سے متضاد اور نا ہموار کیفیات کا انتخاب کرتا ہے جو عام فنکاروں کی نظر سے اوجھل رہتی ہیں ۔

مرزا غالب کی اردو نثر یعنی خطوط نگاری تو غدر کے ہنگاموں سے پہلے شروع ہو چکی تھی ۔ لیکن ان کا وہ اسلوب جس پر آگے چل کر طنز و مزاح کی گہری چھاپ نے حیات جاوداں کا روپ اختیار کیا وہ غدر میں دلی کی تباہی کے بعد ہی نمودار ہوتا ہے ۔ مسلمانوں کی تہذیب کی دھجیاں جب دلی کے گلی کوچوں میں بکھر گئیں اور علم و فضل کی محفلیں اجڑ گئیں تو غالب جیسے فنکاروں کا کوئی پوچھنے والا باقی نہ رہا ۔ فضا میں یاس اور قنوطیت کے گہرے بادل تھے ۔ اور ہنگامی تبدیلی نے زندگی کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی ۔ وہ اتنے شدید ذہنی صدمات سے مقابلہ کرنے کے بعد اپنی فنی صلاحیتوں کو نئے پیرایۂ اظہار میں ڈھالنے میں کامیاب ہو

گئے - انہوں نے زندگی کی نا انصافیوں کو خطوط کے ذریعہ بیان کرنا شروع کر دیا - ان تحریروں میں شوخی و ظرافت اور ادبی نکات ہیں - ہرتحریر پر طنز و مزاح کی گہری چھاپ ہے - مثلاً انہوں نے مزاج پرسی خیریت نگاری - القاب و آداب کی قدیم روایات سے بھی پر لطف پیرائے میں بغاوت کی ہے -

کبھی لکھتے ہیں - ''میاں'' - برخو دار'' - ''بندہ پرور'' - ''مہاراج'' - ''پیر و مرشد'' - ''بھائی صاحب'' - ''میری جان کے چین'' میاں سرفراز حسین - میرے مہربان ''میری جان'' - کبھی یہ سب غائب اور خط اس طرح شروع ہوتا ہے -

''ہاں صاحب تم کیا چاہتے ہو'' -

یا

''مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے''

کبھی کبھی پیرایہ ظرافت سے حسن طلب کا بھی کام لیتے ہیں - کبھی کسی کی فرمائش کو ہنسی ہنسی میں ٹال دیتے ہیں مثلا -

''شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے - طریق صید افگنی سکھاتا ہے جب جوان ہو جاتے ہیں تو آپ شکار کر کھاتے ہیں - تم با شعور ہو گئے - حسن طبع خدا داد رکھتے ہو - ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو علاءالدین احمد خان تیری جان کی قسم ! میں نے بہلے لڑکے کا جو اسم تاریخی نظم کیا ، وہ لڑکا نہ جیا مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ وہ میرے نحوست طالع کی تاثیر تھی - میرا ممدوح جیتا نہیں - نصیرالدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل بسے - واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر سنبھل نہ سکے - جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے وہ عدم سے بھی پرے جا پہنچا -

ظرافت کے نئے نئے پیرائے پیدا کرتے ہیں - ناداری میں کپڑے بیچنے پڑے تو لکھتے ہیں -

''اور لوگ روٹی کھاتے ھیں ۔ میں کپڑا کھاتا ھوں'' ۔ رامپور کے ایک جشن سرکار کے حال میں لکھتے ھیں ۔

''طوائف کا وہ ھجوم ، حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہنا چاھیے ۔''

جب وہ اپنے عزیز دوستوں سے مخاطب ھوتے ھیں تو مزاح کی کیفیت اور زیادہ نکھر آتی ھے ۔ مثلاً ۔

''بندہ گنہ گار ۔ شرمسار عرض کرتا ھے کہ پرسوں غازی آباد کا اٹھا ھوا گیارہ بجے اپنے گھر پرمثل بلائے ناگہانی نازل ھوا ھوں'' ۔

(رامپور سے واپسی پر)

منیجر کو لکھا ۔

''قبلہ ! کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ھمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے ۔ وہ کیا کھاتا اور کیونکر جیتا ھے ۔''

ثاقب کو لکھا ۔

''آج میرے پاس نہ ٹکٹ ھیں نہ دام ۔ معاف رکھنا والسلام'' ۔

ان خطوط کے پس پشت ان یاس انگیز کیفیات سے کون انکار کر سکتا ھے جو غالب کی زندگی پر مسلط رھیں ۔ لیکن کبھی انھوں نے حالات اور زمانے کی ستم ظریفیوں سے مات نہیں کھائی اور یاس کو اپنی ذات پر مسلط نہیں ھونے دیا ۔ اگر ایسا ھوتا تو ان کی لے میں فریاد کا رنگ نمایاں ھو جاتا ۔

لیکن جب چوٹ پڑتی ھے تو وہ خود اپنے آپ پر ھنستے ھیں ۔

نثر میں غالب کے مزاح کی تعمیر میں استعارہ ، ذو معنی الفاظ ، تجنیس اور تضاد نے بھی خوب حصہ لیا ہے ۔ اور دیکھا جائے تو مزاح کی ان کیفیات سے قطع

نظر غالب نے زبان و بیان سے بھی مزاح کی تخلیق میں خاصی مدد لی ہے ۔ اور اگرچہ غالب کے مزاح میں فکر اور اسلوب ۔ کو علیحدہ علیحدہ کرکے دکھانا مقصود نہیں ۔ تاہم ان کے انشاء کے بعض نمونوں میں اسلوب ھی مزاح کا محرک ثابت ھوا ھے ۔ مثلاً ۔

میاں تمہارے دادا میاں امیںالدین خان بہادر ھیں ۔ میں تو تمہارا دلدادہ ھوں،، ۔

ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے ۔ اس سے بڑھ کر یہ ھوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی ۔

،، مجھکو اس وھم نے گھیرا ہے کہ ۔ ۔ ۔ میرا ممدوح جیتا نہیں ۔
نصیرالدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل بسے ۔
واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متعمل ھوئے پھر سنبھل نہ سکے ۔
جسکی مدح میں دس بیس قصیدے کہے وہ عدم سے بھی پرے
جا پہنچا ۔ ،،

غالب

جاوید احمد خان سال دوم

غالب کی خودبینی

خودداری انسان کی جاہ و عظمت ، جلال و جمال ، طنطنہ و ہمہمہ طمطراق کی ضامن اور انسان کو انسانیت کی معراج تک پہنچانے میں ایک بدرقہ کی سی حیثیت رکھتی ہے ۔ عصر حاضر میں پروان چڑھتی ہوئی صنعتی تہذیب اور یکسانیت نے انسان کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ اسکی شخصی خوبیوں کو بھی ختم کر دیا ھے لیکن عہد وسطی میں یہی خوبیاں انسان کا سرمایہ فخر و ناز تھیں انسان انہیں کے سہارے اور انہیں کے بل بوتے پر فخر سے اپنا سر اُٹھا کر آک شان بے نیازی سے چلتا تھا ۔

غالب کو ''آثار غالب،، کے مصنف نے مغلیہ تہذیب کا سچا ترجمان اور حقیقی عکاس کہا ھے ۔ انکے زمانے میں اگرچہ مغلوں کے اقتدار کا سورج ڈوب رہا تھا وہ سلطنت جس کا اثر نفوذ پورے ایشیا میں تھا اور جسکے دبدبہ سے پورے ایشیا میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی ، ریزہ ریزہ ہو رہی تھی لیکن ابھی شخصی قدروں پر زوال نہیں آیا تھا Percival Spear نے "THE TWILIGHT OF THE MUGHALS" میں اس بات پر زور دیا ھے کہ سلطنت کا پرچم سرنگوں ہو رہا تھا لیکن فرد کی گردن میں خم نہیں آیا تھا ۔ سیاسی زوال کے اس تیز و تند طوفان میں کسی شاہ ولی اللہ ، کسی میر تقی میر ، اور کسی غالب کی شخصیت انسانی عظمت کا ھمالیہ بن کر اُبھرتی ہے اور انسانیت کی اعلیٰ و ارفع قدروں کی لاج رکھ لیتی ہے ۔

غالب ترک نسل سے تھے ۔ اسر انویں بڑا ناز تھا ۔ کئی فارسی قطعات میں اور جا بجا خطوں میں اسکا ذکر کیا ہے :۔

غالب از خاک پاک تورانیم | لاجرم در نسب فره مندیم
ترک زادیم و در نزاد همی | به سترگان قوم پیوندیم
ایبکم از جماعهٔ اتراک | در تمامی ز ماه ده چندیم
فیض حق را کمینه شاگردیم | عقل کل را بهینه فرزندیم
هم بتابش ببرق هم نفسیم | هم به بخشش به ابر مانندیم
همه بر خویشتن همی گرییم | همه بر روزگار می خندیم

غالب کا خاندان سپاہی پیشہ تھا ۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ میرے بزرگ افراسیاب کی نسل سے تھے اور تلوار اور تیر چلانے والے تھے ۔ ان کا تیر ٹوٹ کر میرا قلم بن گیا ھے اس قلم کی صریر کبھی نوائے سروش ہے اور کبھی ان کے بے باک ضمیر کی آواز ۔۔ وہ زبان قلم سے جہاں آب حیات ٹپکاتے ہیں وہاں نوک قلم سے نشتر کا کام بھی لیتے ہیں ۔ اندرونی مسئلہ ہو یا بیرونی معاملہ ، تحفظ نفس کے سلسلے میں وہ بہت حساس تھے ۔ کیسی کیسی مصیبتیں نہ سہیں اور کیسے کیسے دکھ نہ اٹھائے مگر مجال ہے کہ انکی شخصیت میں کوئی بھی شگاف پڑا ہو ۔ انکی شخصی خوبیاں انکی ڈھال بن جاتی ہیں اور خودداری کا احساس ان میں سے ایک تھا ۔ اسکی طرف انکے اشعار میں کھلے اشارے مل جاتے ہیں ۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے ، در کعبہ اگر وا نہ ہوا

توفیق بہ اندازہ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

تم انکے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ ''یاد نہیں،،
ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں ، اپنے ہی کو کھو آئے

غالب کی زندگی کے ایسے بیسیوں واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے ان کی خودداری ، غیرت اور غزت نفس کا پتہ چلتا ہے حالی نے ''یادگار غالب،، میں آزاد کی اس روایت پر صاد کیا ھے کہ ۱۸۴۲ء میں دلی کالج میں فارسی کےمدرس کا تقرر ہونا تھا۔ لوگوں نے مرزا اسد اللہ خاں غالب، مومن، اور صہبائی کا ذکر کیا ۔ سب سے پہلے مرزا غالب کو بلایا گیا آپ پالکی پہ سوار ہو کر ٹامس صاحب سیکرٹری پاک و ہند کے مکان پر ملنے کے لئے تشریف لے گئے ۔ مکان پر پہنچ کر اندر ٹامس صاحب کو اطلاع بھجوائی اطلاع بھجوانے پر آپ کو فوراً بلایا گیا لیکن آپ مکان کے گیٹ پر ہی کھڑے ٹامس صاحب کا انتظار کرتے رہے ۔ آخر چار گھنٹے گزر گئے ۱۲ بجے کا وقت چلچلاتی دھوپ میں جانکاہ انتظار آپ کے لئے سوہان روح بن گیا مگر کیا مجال ھے کہ پایۂ استقلال میں ذرا بھی جنبش آنے پائے ۔ اور ادھر ٹامس صاحب پر '' الانتظار اشد من الموت ،، کی کیفیت طاری ہونے لگی تو چار و ناچار باہر نکلے مرزا غالب کو گیٹ پر پالکی میں دیکھ کر ٹھٹکے اور اندر تشریف نہ لانے کے بارے میں استفسار کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ کوئی قاعدہ ھے کہ آپکے در دولت پر چار گھنٹے سے صرف اس لئے کھڑا ہوں کہ کوئی استقبال کے لئے اندر سے نکلے اور مجھکو اندر عزت و تکریم سے لے جاوے اس پر ٹامس صاحب بولے کہ آپ یہاں نوکری کے لئے آئے ہیں اس لئے قاعدہ کی رو سے ہم مجبور نہیں کہ آپ کے استقبال کے لئے ہم اندر سے نکلیں ہاں البتہ اگر آپ اس کے بعد دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپکا شایان شان طریقے سے استقبال کیا جائے گا اور آپکو اعزاز سے اندر لایا جائے گا ۔ مرزا غالب نے اس گفتگو کو سن کر کہا کہ میں مستقبل کے اس بلند مرتبہ اعزاز سے باز آیا جس کے لئے میرا موجودہ اعزاز بھی زوال پذیر ہو جائے یہ کہ کر آپ واپس تشریف

لے آئے۔

غالب کی خودداری کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ کسی کی خودداری یا غیرت کو ٹھیس پہنچتے نہیں دیکھ سکتے تھے ۔ غلام رسول مہر نے مولانا آزاد کی روایت سے وضاحت کی ھے کہ مفتی صدرالدین آزردہ کی حالت غدر میں بہت سقیم ھو گئی تھی ۔ ایک مرتبہ چھینٹ کا فرغل پہنے ان سے ملنے کے لئے آئے ۔ غالب نے انھیں اتنے معمولی لباس میں کبھی نہیں دیکھا تھا ، دل بھر آیا ۔ غالب نے چھینٹ کے فرغل کی بہت تعریف کی اور کہا کہ مجھے بھی ایسا بنوا دیجئے ۔ مفتی صاحب نے کہا کہ اگر آپ کو یہی پسند ہے تو یہی لے لیجئے ۔ غالب نے کہا کہ جاڑا شدت سے پڑ رہا ھے ۔ آپ یہاں مکان سے کیا پہن کر جائینگے اسکے ساتھ ھی اپنا مالیدہ کا لیا چغہ ان کو پہنا دیا ۔

غالب کی اصل شان یہ ہے کہ وہ کبھی خودداری سے دست بردار نہیں ہوتے ھیں میر کی خودداری بھی مسلم ہے مگر عشق کی وادی میں داخل ہونے کے بعد میر کی خودداری انکو تسلیم و رضا کی راہ دکھاتی ہے ۔ مگر غالب کے ھاں یہ گم شدگی اور سپردگی کی کیفیت نہیں ۔ نشاط و سرمستی کے عالم میں بھی ان کارشتہ زمین سے منقطع نہیں ہوتا ۔ غالب کی عشقیہ شاعری میں ایسے لمحے نہ ہونے کے برابر ھیں جہاں دل پر قابو نہ رہے انکی خودداری انھیں ہر وقت لیے دبے رہتی ھے ، کہتے ھیں

مجبوری و دعوئ گرفتاری الفت
دست تہ سنگ، آمدہ پیمان وفا ھے

غالب کی شخصیت بڑی پہلودار اور پرکشش ہے ۔ جن خوبیوں کی وجہ سے وہ ھمارے دلوں کے بہت قریب ھیں ، ان میں ایک خودداری ھے ۔ یہ احساس اپنے آپکو اکثر و بیشتر منواتا نظر آتا ھے مگر جہاں اس کے برعکس ہونے کا احتمال ہوتا ہے وہاں بھی اسی کا کوئی نہ کوئی نیا روپ ہوتا ہے ۔

غالب کا نفسیاتی مطالعہ

ایک آدمی جو کچھ بھی کہتا ہے اس سے اس کے خیالات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اس کے باطن کی بھی ایک جھلک نمایاں ہو جاتی ہے جس کے ذریعہ اس انسان کی اندرونی شخصیت کچھ نہ کچھ ضرور سامنے آ جاتی ہے ۔ نثر ہو یا نظم دونوں ہی خیالات کے اظہار کے طریقے ہیں ان دونوں ہی کے ذریعے انسان کے ذہن کا عکس سطح کاغذ پر منتقل ہو جاتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ نثر کے ذریعہ انسان زیادہ اچھی طرح اپنی بات پیش کر سکتا ہے لیکن یہ بات بھی غلط نہیں ھے کہ جتنا اثر انسان نظم سے لیتا ہے اتنا اثر وہ نثر سے نہیں لیتا ۔ ایک انسان کی نفسیات اس کی ہر حرکت سے کچھ نہ کچھ ضرور سامنے آ جاتی ہے اور تحریر کے ذریعہ تو انسان کی نفسیات معلوم کرنے میں بے انتہا مدد ملتی ہے ۔ غالب کے اشعار کے نفسیاتی مطالعہ سے غالب کی جو تصویر بنتی ہے وہ غالب کی اس تصویر سے کافی مختلف ھے جو ایک عام ذہن میں پنہاں ہے ۔ غالب ایک عام ذہن میں کیا ہے ؟ اس کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے ۔ آج ہم غالب کے شعروں کو بطور رنگ استعمال کرکے اس کی نفسیاتی تصویر بناتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس میں اور ایک عام ذہن والی تصویر میں کتنا فرق ہے ۔ غالب کا ایک شعر ہے ۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ویسے تو اس شعر کے معنی بالکل سیدھے نظر آتے ہیں یعنی غالب سمجھتے ہیں کہ حقیقت میں جنت اور دوزخ کا کوئی وجود نہیں ہے اصل بات یہ

ہے کہ خدا نے انسان کو صحیح راستے پر ڈالنے کے لئے جنت اور دوزخ کا تصور پیدا کیا ہے - اگر اس شعر کو نفسیاتی کسوٹی پر پرکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ غالب خود اپنے دل کو یہ کہکر بہلا رہے ھیں کہ جنت کا کوئی وجود نہیں ہے - نفسیات میں یہ بات کافی کھلی ہوئی ہے کہ کوئی شخص جس چیز کو پسند نہیں کرتا وہ اس بات کو خود ظاہر کرنا نہیں چاھتا بلکہ چاھتا ہے کہ وھی بات کسی دوسرے ذریعہ سے لوگوں تک پہنچے - غالب اس شعر میں اپنی اس ڈھکی چھپی خواهش کا اظہار کرتے ھیں کہ کاش جنت اور دوزخ نہ ھوتے لیکن چونکہ ایسا نہیں ہے اس لئے وہ اپنے بہلانے کا کام بھی شعر سے لیتے ھیں لیکن بہلاوے کا الزام خدا پر رکھ دیتے ھیں - یہ بھی انسان کی نفسیات ھے - غالب کا ایک اور شعر ہے -

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پہلے شعر کی طرح اس شعر میں بھی غالب کوئی الزام اپنے سر لینے کو تیار نہیں ھیں وہ اپنی زندگی کے اچھے نہ گزرنے کا قصور وار خدا کو ٹھراتے ھیں اور خود صاف دامن بچا جاتے ھیں - اس شعر سے ایک ایسے آدمی کی نفسیات سامنے آتی ہے جو خود کو کبھی غلط نہیں سمجھتا یا دوسرے الفاظ میں خود پسند ھے - غالب کی خود پسندی ثابت کرنے کے لئے ایک اور شعر پیش کیا جا سکتا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ غالب خود میں مگن رہنے والے آدمی تھے - شعر یہ ہے -

جہاں میں ھو غم و شادی بہم ھمیں کیا کام
دیا ھے ھمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

غالب کے تنقید سے بچنے کی دلیل میں یہ شعر بطور ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے صاف صاف الفاظ میں کہا ہے کہ انہیں کسی قسم کی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے وہ کہتے ہیں -

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

غالب کے تین شعر ہیں جن کے معنی زیادہ مختلف نہیں ہیں شعر یہ ہیں -

نادان ہو جو کہتے ہو کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے
مرتا ہوں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

ان تینوں شعروں کا مضمون موت ہے - ہر ایک شعر میں غالب موت کی تمنا کرتے نظر آتے ہیں - کبھی وہ کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے کہ ہم کو زندگی کی آرزو ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمکو زندگی کی بالکل تمنا نہیں ہے کبھی وہ مرنے کی امید پہ جیتے نظر آتے ہیں اور کبھی وہ کہتے ہیں کہ جس شخص کی ساری امید موت سے وابستہ ہو تو اگر اس کی امید پوری نہ ہو تب اس کی حالت قابل رحم ہے - ان تمام اشعار میں غالب موت کے آرزو مند نظر آتے ہیں لیکن نفسیات کی رو سے اگر ان اشعار کو سمجھا جائے تو اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ غالب حقیقت میں زندگی سے والہانہ پیار کرتے تھے لیکن چونکہ انسان کی نفسیات ہے کہ حقیقت کو خفیہ رکھے اسی لئے وہ موت کے الفاظ میں زندگی سے پیار کرتے ہیں -

دنیا میں ایسے بہت ہی کم لوگ ہیں جو غموں اور پریشانیوں کو

خندہ‌پیشانی سے قبول کریں اور ان کا خوشدلی سے استقبال کریں غالب ایک ایسے ہی آدمی تھے ان کے اشعار اس حقیقت کو ثابت کرتے ھیں لیکن ان کے ایسے اشعار کی زبان پر اگر غور کیا جائے تو ان کی اس وقت کی نفسیاتی حالت سامنے آ جاتی ھے یعنی شعر کہتے وقت ان پر کیا کیفیت طاری تھی مثلاً ایک شعر ہے -

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ھیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس شعر کی زبان پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ھے کہ غالب نے یہ شعر انتہا درجہ کی مایوسی کے بعد اپنے دل کو سکون پہنچانے کے لئے کہا تھا ان کی مایوسی میں یہ شعر کہنے کے بعد ضرور کمی واقع ہوئی ہوگی کیونکہ نفسیاتی نقطہ نظر سے اگر کسی چیز کی انتہا سوچ لی جائے تو اس چیز کا خوف کم ہو جاتا ھے اور دل کو سکون مل جاتا ھے -

سکون کا ذکر آیا تو یہ بات سامنے آئی کہ غالب اگرچہ شعروں میں سکون کے متلاشی نظر آتے ھیں لیکن ان کی طبیعت ہنگامہ پرور تھی - وہ سکون کو پردہ بنا کر ان باتوں کو چھپاتے ھیں جو دنیا کی نظر میں اچھی نہیں - دوسرے الفاظ میں اپنی نفسیات کے عین مطابق اپنا کوئی قصور مان لینے کو تیار نہیں ھیں بلکہ بات کا رخ پھیر کر اپنا دامن صاف بچا لیتے ھیں اور آدمی اصلی بات کو بھول کر دوسری بات میں الجھ جاتا ہے - اس بات کے ثبوت کے لئے یہ شعر پیش ہے -

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

مذھب کے بارے میں غالب کے شعروں کے نفسیاتی تجزیہ کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ انسانی قدروں کو مذھبی قدروں سے بڑا سمجھتے تھے - غالب مذھب سے بہت قریب نہ تھے کبھی کبھی انہیں اس بات کا احساس بھی

ہوتا تھا لیکن مختلف اسباب کا پردہ بنا کر اس کے پیچھے پناہ لیتے اور یہ بات ثابت کرکے چھوڑتے کہ وہ گناہگار ضرور ہیں لیکن کافر نہیں - کبھی وہ کہتے کہ

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یعنی وہ اس بات کو تو تسلیم کر لیتے کہ مذہب سے دور نہ ہونا چاہئے لیکن اپنی معذوری بھی پیش کرتے جاتے ہیں -

غالب مشورہ دینے اور تنقید کرنے میں کبھی نہ چوکتے تھے یہ بات ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں لیکن خاص بات یہ ہے کہ وہ خدا کو بھی مشورے دیتے تھے - کبھی کبھی وہ جنت اور دوزخ پر تنقید کرتے اور کبھی اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لئے کہتے -

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر

غالب کی یہ بہت بڑی خوبی اور اردو شاعری میں اولیت ہے کہ انہوں نے خدا سے کڑی تنقید کے ساتھ باز پرس کا لہجہ اختیار کیا -

★

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اسمیں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

(غالب)

نالۂ دل

آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں ۔ جتنی گرد اڑی اس سب کو از راہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی،، ۔

حیات غالب

(اردو خطوط کے آئینے میں)

پیدائش : سنو عالم دو ہیں ، ایک عالم ارواح اور ایک عالم اب و گل ۔ ۔ ۔ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم اب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں ۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا ۔

خاندان اور مالی حالت : میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں ۔ دادا میرا ماوراالنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا ۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی ۔ صرف پچاس گھوڑے نقارہ و نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا ۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا ۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوا ، وہ علاقہ نہ رہا ۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا ۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نظام علیخاں کا نوکر ہوا ۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا ۔ کئی برس وہاں رہا ۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی ۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا ، راؤ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا ۔ نصراللہ بیگ خان میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا اس نے مجھے پالا - ۱۸۰۶ء میں جرنیل صاحب کا عمل ہوا ، صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا ۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا ۔ چار سو سوار کا برگڈیر ہوا ۔ ایک ہزار روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ

روپیہ سال کی جاگیر حین حیات علاوہ سال بھر مرزبانی کے تھے کہ بمرگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ بر طرف ہو گیا ۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی وہ اب تک پاتا ہوں ۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا ۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا ۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا ، نواب گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی ، دفتر دیکھا گیا ، میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا ، ملازمت ہوئی ۔ سات پارچے اور جیغہ سر پیچ مالائے مروارید ۔ یہ تین رقم کا خلعت ملا ۔ زاں بعد جب بھی دلی میں دربار ہوا مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا ۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے ۔ میری بریت کی درخواست گزری ، تحقیقات ہوتی رہی ۔ تین برس بعد پنڈ چھوٹا اب خلعت معمولی ملا ۔ غرض کہ یہ خلعت ریاست کا ہے عوض خدمت نہیں ۔ انعامی نہیں ۔

میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا ۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا ۔ اس کی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکاہ حقیقی کے واسطے، شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے، انہوں نے نہ دیئے ، مگر تین ہزار روپیہ سال اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپیہ سال ۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا ، کولبرک صاحب بہادر ریذیڈنٹ دھلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرٹر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر ، ریذیڈنٹ معزول ہوئے ، سکرٹر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے ، بعد ایک زمانہ کے بادشاہ دھلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا ، ان کے ولیعہد نے چار سو روپیہ سال ۔ ولیعہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے ۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری پانچ سو روپیہ سال مقرر ہوئے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیئے یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی ۔ دلی کی سلطنت سخت جان تھی سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی ۔

نواب یوسف علی خاں بہادر بیس تیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں ۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے اب جولائی ۱۸۵۹ سے

سو روپیہ ماہ بماہ بھیجتے ہیں ۔

حلیہ : تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا ۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے ۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا ، کس واسطے کہ جب جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اسکی ستائش کرتے تھے اب جو کبھی مجھ کو اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے ۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ ڈاڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے ۔ وہ مزے یاد آئے کیا کہوں جی پر کیا گزری ۔ ۔ ۔ جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے ، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے ۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے ، عالم ، ملا ، حافظ ، بساطی ، نیچہ بند ، دھوبی ، سقہ ، بھٹیارہ کنجڑا ، منہ پر ڈاڑھی سر پر بال ۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی ، اسی دن سر منڈوایا ۔

تعلیم : میں نے ایام دبستان نشینی میں شرح ماتہ عامل تک پڑھا ۔ بعد اس کے لہو لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا ۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری اور طبعی تھا ۔ ناگاہ ایک شخص کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن و موحد صوفی صافی تھا میرے شہر میں وارد ہوا اور لطائف فارسی بحث (خالص فارسی بے آمیزش عربی اور غوامص فارسی آمیختہ بہ عربی) اس سے میرے حال ہوئے سونا کسوٹی پر چڑھ گیا ۔ ذہن معوج نہ تھا زبان وری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ جاماسپ عہد اور بزر جمہر عصر تھا حقیقت اس زبان کی دلنشین اور خاطر نشان ہو گئی ۔

علم و ہنر سے عاری ہوں لیکن بچپن سے محوسخن گزاری ہوں ۔ مبداء فیاض کا مجھ پہ احسان عظیم ہے ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے ۔ فارسی کے ساتھ مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں ۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا

ہوں ۔ مناسبت خدا داد ۔ تربیت استاد ۔ حسن و قبح ۔ ترکیب پہچاننے، فارسی کے غوامض جاننے لگا ۔

کلام : میرا کلام کیا نظم ، کیا نثر ۔ کیا اردو کیا فارسی ۔ کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا ۔ دو چار دوستوں کو اسکا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لیکر جمع کر لیا کرتے تھے ۔ سو ان کے لاکھوں روپے کے گھر لٹ گئے ۔ جسمیں ہزاروں روپے کے کتب خانے بھی جل گئے ۔ اسی میں وہ مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہوئے ۔

شکایت زمانہ : اگرچہ یک فنہ ہوں مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازہ بایست بائی نہیں ۔ آپ ہی کہا ۔ آپ ہی سمجھا ۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دوائمی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ۔ ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے ۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں ، کبھی شیراز جا نکلا ، کبھی مصر میں جا پڑا ، کبھی نجف جا پہنچا نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں ، اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی ، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے ۔

آخری ایام : صعف نہایت کو پہنچ گیا ۔ رعشہ پیدا ہو گیا ۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا ۔ حواس مختل ہو گئے ۔ جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجا لایا ، اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اور اصلاح دیتا تھا ۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے ۔ کہتے ہیں شاہ شرف بو علی قلندر کو بسبب کبیر سن کے خدا نے فرض اور پیغمبر نے سنت معاف کر دی تھی ۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمت اصلاح اشعار مجھ بر معاف کر دیں ۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے لکھ دیا کروں گا ۔

ایک کم ستر برس دنیا میں رہا کوئی کام دین کا نہیں کیا افسوس صد ہزار افسوس ۔ (۱۸۶۷)

کتاب دستنبو کا ترجمہ (خلاصہ)

(مرزا یعقوب بیگ نامی)

دستنبو کا یہ خلاصہ " غالب کا روزنامچۂ غدر " سے ماخوذ ہے - یہ روزنامچہ حضرت خواجہ حسن نظامی نے مرزا غالب کے خطوط سے ترتیب دے کر ۱۹۲۱ء میں شائع کیا تھا - اسی کے آخر میں خواجہ صاحب نے " دستنبو " کے ترجمہ کا وہ حصہ جو واقعات غدر سے متعلق ہے مرزا یعقوب بیگ نامی سے ترجمہ کرا کے شامل کیا - مرزا یعقوب بیگ نامی کے متعلق خواجہ صاحب نے لکھا ہے " جناب نامی کے دادا جناب مرزا فتح اللہ بیگ المعروف مرزا رجب اللہ بیگ مرحوم مرزا غالب کے چچا زاد بھائی تھے "۔ دستنبو کے متعلق خواجہ صاحب لکھتے ھیں :-

> " غالب نے ایام غدر میں یہ کتاب لکھی تھی جبکہ شرفا اور خصوصاً مسلمانوں کا سانس خوف و مایوسی سے گھٹ رہا تھا اس لئے اگر ان کی رائے زنی میں مصلحت کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آئے تو موجودہ نسلوں کو اعتراض نہ کرنا چاھئے - کیونکہ غالب نے باوجود نزاکت وقت بعض باتیں ایسی آزادی و بیباکی سے لکھدیں کہ کوئی اور لکھنا چاھتا تو دارو گیر کے اس ھولناک وقت میں نہ لکھ سکتا - "

ھمارا خیال ہے خواجہ صاحب مرحوم کی یہ رائے حرف بحرف درست ھے - دستنبو کا یہ ترجمہ اب کمیاب ہے اس لئے " دبستان " میں اسے شامل کیا جا رہا ہے -

واقعہ غدر پر مصنف کی رائے

آج ابتری کا زمانہ ہے ھر ایک نے اپنی چال کو چھوڑا ھے - سپاہ نے

ہر جگہ سپہ سالار سے منہہ موڑا ہے بلکہ زمانہ خود اپنی چوکڑی بھولا ہے۔ ستارہ شناسوں کی رائے ہے کہ جب یزد جرد شاہ ایران پر غازیان عرب کے ہاتھوں تباہی آئی تو برج سرطان میں زحل اور مریخ کا اتصال تھا اور وہ تباہی اتصال کا نتیجہ تھی۔ آج کل پھر برج سرطان میں مریخ اور زحل کا اجتماع ہوا ہے اسی لئے ہرطرف فتنہ و فساد۔ جنگ و جدل برپا ہے۔ مگر اہل دانش اس بات کو کب مانیں گے۔ وہاں دو مخالف مملکتوں کی فوجوں کے درمیان جنگ تھی۔ یہاں فوج نے خود اپنے بادشاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے۔ اس لئے ان دونوں حملوں میں کوئی مشابہت اور دونوں حملہ آوروں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ وہاں ایک مذہبی جنگ تھی جس کے بعد اہل اسلام نے نئی شان و شوکت سے ویران ایران کو شاد و آباد کیا۔ اور نئے مذہب یعنی اسلام نے ملک کو نور ایمان سے معمور اور ظلمت آتش پرستی کو ملک سے دور کیا۔ لیکن یہاں کہ لڑائی قانونی ہے، حیران ہوں اہل ہند نے کس نئے قانون کی امید میں بیر بسایا ہے اہل فارس نے آتش کو کھو کر خدا کو پایا۔ لیکن متحیر ہوں کہ اہل ہند نے کس امید پر ارباب عدل و انصاف کا دامن چھوڑا اور درندہ خال باغیوں سے رشتہ جوڑا ہے۔ انصاف کی پوچھو تو جو شخص امن و امان، چین و آرام سوائے قلمرو انگریزی کے کہیں اور تلاش کرتا ہے نابینا ہے۔ ایران میں تیغ عرب کے زخم خوردوں کو اسلام نے تلافی کا مرہم عطا کیا۔ ہند میں غدر کی مصیبت کے بعد وہ کونسی راحت ہے جس سے زمانہ نے مصیبت زدگان غدر کے مصائب کی تلافی کی ہے۔ ارباب دانش بتلائیں کہ وہ کونسی بہتری اور بہبودی ہے جو اس ہنگامہ غدر سے ملک و ملت کو حاصل ہوگی؟

اہل ملک والیان ملک سے لڑ رہے ہیں۔ لشکری سالار لشکر کا خون کر رہے ہیں۔ اور پھر خوش ہیں، خدا کے غضب سے نہیں ڈرتے۔ کہاں ہیں حکمت الٰہی کے جاننے والے۔ کہاں ہیں نفع و نقصان نیک و بد کے پہچاننے والے بتلائیں کہ اس ہنگامہ کا گرم ہونا غضب الٰہی کے سوا کسی اور وجہ سے ہو سکتا ہے؟

باغیوں کا دهلی میں داخل هونا ـ اهل شهر کی بے بسی اور انگریزوں کا کشت و خون ـ

۱۶ ماہ رمضان ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو علی‌الصباح یکایک دهلی کی شهر پناه اور قلعہ کی در و دیوار میں زلزله پیدا هوا یعنی میرٹھ چھاؤنی سے کچھ باغی سپاهی بھاگ کر دهلی آئے ـ سب کے سب بغاوت پر کمر بستہ اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے ـ شهر پناه کے محافظوں نے جو باغیوں کے ساتھ هم پیشه هونے کی وجه سے قدرتاً هـمدردی رکھتے تھے اور جو ممکن ہے پہلے سے ان کے ساتھ عهد و پیمان بھی کر چکے هوں ـ دروازے کھول دیئے اور حق نمک اور حفاظت شهر کو بالائے طاق رکھ کر ان ناخوانده یا خوانده مهمانوں کا خیر مقدم کیا ـ ان سبک عنان سواروں اور تیز رفتار پیادوں نے جب شهر کے دروازوں کو کھلا هوا اور دربانوں کو مهمان نواز پایا تو دیوانه وار هر طرف دوڑ پڑے اور جهاں جهاں انگریز افسروں کو پایا قتل کر ڈالا اور ان کی کوٹھیوں میں آگ لگا دی ـ اهل شهر جو سرکار انگریزی کے نمک خوار تھے اور حکومت انگریزی کے سایه میں امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے ـ هتیار سے بیگانه ـ تیر و تبر میں بھی امتیاز نہ کر سکتے تھے ـ نہ هاتھ میں تیر رکھتے تھے نه شمشیر ـ سچ پوچھو تو یه لوگ صرف اس مطلب کے تھے که گلی کوچے آباد کریں ـ اس گون کے هرگز نه تھے که جنگ و جدل کے واسطے کمر بستہ هوں ـ اس کے علاوه تیز رو سیلاب کو گھانس پھونس کب روک سکتا ہے ـ ان غریبوں نے اپنے آپ کو اس آفت ناگهانی کے آگے عاجز اور بے بس پایا اس لئے گھروں کے اندر غم اور ماتم میں بیٹھ رہے بنده بھی انهی ماتم زدگان میں سے ہے ـ گھر میں بیٹھا تھا که شور و غوغا بلند هوا ـ قبل اس کے سبب دریافت هو چشم زدن میں صاحب ایجنٹ بهادر کے قلعہ میں مارے جانے کی خبر آئی ـ ساتھ هی معلوم هوا که سوار اور پیادے هر گلی کوچه میں گشت لگا رہے هیں ـ پھر تو کوئی ایسی جگه نہ تھی جو گل اندامون کے خون سے رنگین نه هو اور باغ میں کوئی جائے گلگشت ایسی نه تھی جو ویرانی میں مانند

گورستان نہ ہو ۔ کیسے کیسے انگریز افسر منصف مزاج ، دانشور ، نیک خو ، نام آور ، تلوار کے گھاٹ اترے ۔ کیسی کیسی پری چہرہ ، نازک اندام خاتونان فرنگ خاک و خون میں نہائیں ۔ افسوس ان کے ننھے ننھے بچے جنکی شگفتہ روئی لالہ و گل پر ہنستی تھی اور جن کی خوش خرامی کبک و چکور کو شرماتی تھی کس طرح تیغ بیدریغ کی نذر ہوئے ۔ اگر موت ان مقتولوں کے سرہانے ماتم میں سیاہ پوش ہو کر گریہ و زاری کرے تو روا ہے ۔ اگر آسمان خاک ہو کر برسے اور زمین غبار ہو کر اڑے تو بجا ہے ۔

اے نو بہار چوں‌تن بسمل بخوں بغلط
اے روزگار چوں شب بے ماہ تار شو
اے آفتاب روئے بسیلی کبود کن
اے ماہ تاب داغ دل روزگار شو

باغیوں کا طرز عمل اور اس پہ مصنف کی رائے

خدا خدا کرکے وہ دن گزرا ۔ اور شام ہوئی ۔ سیاہ دل باغیوں نے نہ صرف جا بجا شہر میں قیام کیا بلکہ قلعہ میں شاہی باغ کو اصطبل اور شاہی محلسرا کو اپنی خواب گاہ بنایا ۔ رفتہ رفتہ دوسرے مقامات سے خبر آئی کہ باغی سپاہیوں نے فوجی افسروں اور انگریز عہدہ داران کو قتل کر دیا ۔ اور جوق در جوق سپاہی اور کاشتکار متفق اور متحد ہو رہے ہیں اور سب کے سب بغاوت پر کمر بستہ ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب کے سب جھاڑو کی طرح ایک ہی بندھن میں بندھے ہوئے ہیں ۔ کیوں نہ ہو ، ہندوستان پر اس طرح جھاڑو پھیرنے کے لئے کہ اگر آرام و آسائش گھاس کے تنکے کے برابر بھی ڈھونڈیں تو کہیں میسر نہ آئے ایک ایسی ہی جھاڑو کی ضرورت ہے ۔ ہزار ہا لشکر جمع ہو رہا ہے مگر ہر لشکر ایک بے سری فوج ہے ۔ تماشہ یہ ہے کہ توپ ۔ بندوق گولہ بارود سب انگریزوں ہی سے حاصل کیا اور پھر انگریزوں ہی سے لڑائی ہے ۔ قواعد جنگ فنون سپہ گری سب انگریزوں ہی سے سیکھے اور انگریزوں ہی کے مقابلہ میں ان کے استعمال کی تیاری ہے آخر دل ہی ہے سنگ و خشت تو نہیں کہ نہ جلے

آنکھ ہے، روزن دیوار نہیں کہ نہ روئے ۔ دل کیوں نہ جلے کہ بیگناہ انگریزوں کے قتل کا داغ لئے ہوئے ہے آنکھ کیوں نہ روئے کہ کہ ہندوستان کی تباہی دیکھ رہی ہے ۔ شہر، والیان شہر سے خالی ہو کر بے آقا کے غلاموں سے معمور ہیں ۔ چور اور ڈاکوؤں کو نہ گرفتاری کا ڈر ہے نہ قید کا خطرہ ۔ محلے ویران اور بازار لوٹ کا میدان ہیں ۔ ڈاک بند ہے جس سے نہ صرف نامہ و پیام بلکہ تمام کام درہم برہم ہیں ۔ حامیان دین و آئین فرمائیں کہ کیا یہ رونے کا مقام نہیں کہ ڈاک جیسی نعمت خداداد درہم برہم ہو جائے ۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ مصیبت نازل ہو اور عزیزوں کو عزیزوں کی مصیبت کی خبر تک نہ ہو - نیرنگی زمانہ دیکھئے کہ جو کشور کشائی اور جانبازی کا دم بھرتے تھے آج اپنے سایہ سے ڈرتے ہیں اور نقیب و چوبدار، شاہ و گدا سب پر حکومت کرتے ہیں ۔ پھر ستم یہ کہ مصیبت پر گریہ و ماتم کرو تو نشانہ ملامت و ظرافت بنو ۔ اگر آفت سے بیزار اور اس ماتم میں سینہ فگار ہو تو ضعف ایمان کے طعنے سنو ۔

دھلی میں باغیوں کا اجتماع اور لڑائی کا آغاز ۔

الغرض سرکش باغیوں نے شہر میں داخل ہوتے ہی جو کچھ زر و مال اپنے ساتھ لائے تھے سب شاہی خزانے میں داخل کر دیا اور آستان شاہی پر جبین اطاعت کو رکھا ۔ چشم زدن میں بے انتہا فوج دھلی میں جمع ہو گئی چونکہ ضعیف بادشاہ اس بے شمار لشکر کو نہ روک سکا ، اور قابو میں نہ رکھ سکا بے قابو ہو گیا اور لشکر کے قابو میں آ گیا ۔ باغیوں کا قاعدہ تھا کہ جہاں جہاں سے گزرتے قید خانوں سے قیدیوں کو چھوڑتے جاتے تھے ۔ چنانچہ پرانے پرانے قیدی قید سے رہا ہو کر دربار میں حاضر ہوئے اور خدمتگاری اور سرداری کے باصرار خواستگار ہوئے ۔ کمال یہ ہے کہ ہر شخص کو دربار شاہی میں باریابی حاصل ہو جاتی تھی ۔ غرض شہر کے اندر اور باہر کم و بیش پچاس ہزار پیادے اور سوار جمع ہو گئے ۔ انگریزوں کے پاس علاقہ دھلی میں سے سوائے اس پہاڑی کے جو شہر کے پہلو میں واقع ہے اور کچھ باقی نہ رہا ۔ چنانچہ ان اہل دانش نے اسی جائے تنگ میں دمدمے اور مورچے بنائے اور اپنی زبردست توپیں لگائیں ۔ دیسیوں نے بھی جو توپیں میگزین

سے اڑائی تھیں ان کو لے جا کر قلعہ پر نصب کیا اور دونوں جانب سے گولہ‌باری شروع ہوئی ۔ مئی اور جون کی گرمی تھی اور آفتاب کی حرارت دن بدن زیادتی پر تھی ۔ باغی ہر روز صبح کو انگریزی فوج کے مقابلہ کے واسطے نکلتے اور سورج غروب ہونے سے پہلے واپس آ جاتے تھے ۔

حکیم احسن‌اللہ خان صاحب پر حملہ ۔

اندرون شہر کی کیفیت بھی سننے کے قابل ہے ایک شخص جو حکیم احسن‌اللہ خان صاحب کا پروردہ اور آوردہ تھا اور جو خیانت سے بہت کچھ روپیہ جمع کر چکا تھا اس خیال سے کہ جب تک حکیم صاحب جنکو اسکی خرد برد کا علم تھا ، زندہ ہیں راز فاش ہونیکا اندیشہ رہے گا ۔ ان کے قتل کے درپے ہوا ، اور یہ افواہ اڑائی کہ حکیم صاحب انگریزوں کے خیر خواہ اور طرفدار ہیں ۔ اس طرح باغیوں کو ان کے خلاف بر انگیختہ کیا ، چنانچہ ایک روز بد بخت باغی حکیم صاحب کو قتل کرنے کے لیے ان کے دولت کدہ پر حملہ آور ہوے مگر خوش قسمتی سے حکیم صاحب اس وقت قلعہ میں بادشاہ کی خدمت میں تشریف رکھتے تھے ۔ چنانچہ ان ناہنجاروں میں سے کچھ لوگ قلعہ میں پہنچے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا ۔ بادشاہ سلامت نے اپنے آپ کو حکیم صاحب پر ڈال دیا اور ان کی جان بچائی ۔ اگرچہ حکیم صاحب کی جان بچ گئی مگر بد بخت باغیوں کو اس وقت تک چین نہ آیا جب تک انہوں نے حکیم صاحب کا مکان لوٹ کر اس میں آگ نہ لگا دی ۔ افسوس کوئی غلام جب تک اس کی اصل میں فرق نہ ہو اپنے آقا کے ساتھ ایسا نہ کرے گا ۔

بہادر شاہ کے معاون ۔

جب شاہی جھنڈے کے نیچے بکثرت پیادہ و سوار جمع ہو گئے تو تفضل حسین خان والئ فرخ آباد نے جو پہلے کبھی بادشاہ کی طرف رخ بھی نہ کرتا تھا ۔ ایک خط کے ذریعے اپنی اطاعت کا اظہار کیا ۔ ادھر خان بہادر خان نے بریلی میں ایک عظیم‌الشان لشکر جمع کرکے علم بغاوت بلند کیا اور ایک سو ایک اشرفیاں اور

آراستہ ہاتھی گھوڑے بادشاہ کی خدمت میں بطور پیشکش روانہ کیے ۔ لیکن نواب یوسف علی خاں بہادر فرمانروائے رامپور نے جن کی دوستی سرکار انگریزی کے ساتھ بے حد استوار تھی ۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک خشک پیام ہی بھیجنے پر اکتفا کی اور یہ بھی صرف ہمسایوں کے طعنوں سے بچنے کے واسطے کیا ۔ لکھنؤ میں بغاوت شروع ہوتے ہی صاحبان انگریز شہر سے نکل گئے اور دیگر مستحکم مقامات میں اپنے بھائیوں اور فدائیوں سے جا ملے لیکن بعض افسران انگریز اپنے ہمراہیوں سمیت لکھنؤ ہی میں مقام بیلی گارد میں قلعہ بند ہو گئے ۔ شرف الدولہ نے جو شاہان اودھ کا وزیر مشہور تھا ۔ واجد علی شاہ کی اولاد میں سے ایک دہ سالہ لڑکے کو تخت پر بٹھایا اور خود وزیر بنا اور ایک پیشکش گرانبہا شاہ دہلی کی خدمت میں روانہ کیا۔ جب یہ نذرانہ بادشاہ کی خدمت میں پہنچا تو بادشاہ کو اپنی کامیابی کی کافی امید ہو گئی اور خیال کیا کہ پھر ستارہ اقبال چمکا ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد بادشاہ کا ستارہ اقبال ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ۔

شہر دہلی کے اندر لڑائی اور قتل و غارت گری اور اس پر مصنف کی رائے ۔

۱۴ ستمبر ۵۷ء کو انگریزی سپاہ نے اس شد و مد کے ساتھ کشمیری دروازہ پر گولہ باری کی کہ کالوں کی سپاہ میں بھگدڑ پڑ گئی ۔ اگرچہ گیارہ مئی سے چودھویں ستمبر تک چار ماہ اور چار روز کا وقفہ تھا ۔ لیکن چونکہ شہر دو شنبہ ہی کے روز ہاتھ سے نکلا اور دو شنبہ ہی کو پھر قبضہ میں آگیا ۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی دن کے اندر شہر ہاتھ سے نکلا اور ہاتھ میں آگیا ۔

غرض فتح مند فوج اس سڑک سے جو ان کے سامنے تھی شہر میں داخل ہوئی جو شخص راہ میں ملا قتل کر دیا گیا ۔ معززین شہر اپنی آبرو کو بچائے ہوئے گھروں میں پڑے رہے ۔ باغی شہر سے بھاگ نکلے کچھ ایسے تھے جنھوں نے مقابلہ کیا اور سینہ سپر ہو کر لڑے اپنے نزدیک دوسروں کو کاٹا مگر میرے نزدیک اہل دہلی کی جڑیں کاٹ گئے ۔ دو تین روز تک شہر میں کشمیری دروازہ سے لے کر چاروں طرف کوچہ و بازار میدان کار زار بنے رہے رفتہ رفتہ صرف تین دروازے یعنی

اجمیری دروازہ ، ترکمان دروازہ اور دھلی دروازہ کالوں کے قبضہ میں رہ گئے ۔
گوروں نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے گناہوں اور بیواؤں کو قتل کرنا شروع کیا اور جا بجا مکانات میں آگ لگا دی ۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی مقام سخت خونریزی کے بعد حملہ آور کے قبضہ میں آتا ہے تو اس مقام کے رہنے والوں پر اسی سم کی سختیاں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں ۔

جب اھل شہر نے فتحمندوں کی یہ کینہ پروری اور غیظ و غضب دیکھا تو ان کی امید نا امیدی سے بدل گئی اور بے شمار غرباء و شرفا اپنی مستورات کو لے کر ان تینوں دروازوں میں سے شہر چھوڑ کر نکل گئے اور شہر کے باھر چھوٹی چھوٹی بستیوں اور قبرستانوں میں جا کر دم لیا ۔ اور جب وھاں بھی چین نہ ملا تو ان میں سے بہت سے سفر کے مصائب اٹھاتے دور دراز مقامات میں چلے گئے ۔

۱۴ ستمبر کے بعد پانچ روز تک شہر کے اندر کالے اور گوروں میں جا بجا لڑائی ہوتی رھی یہاں تک کے کالے پیچھے ھٹتے گئے اور گورے شہر پر قابض ہوتے گئے۔ بالاخر ۱۸ ستمبر کو جمعہ کے روز شہر کالوں سے خالی ھو گیا اور دھلی اور قلعہ دھلی پر انگریزوں کا پورا پورا تسلط ھو گیا ۔ اسکے بعد پکڑ دھکڑ قتل و غارت گری کا بازار اور زیادہ گرم ھوا ۔

گوروں کا تشدد اور اس پر مصنف کی رائے ۔

یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ اس شہر گرامی میں مختلف علاقوں میں طریقۂ سخت گیری مختلف رھا اور تشدد و تظلم سب پر یکساں نہ تھا ۔ ھر شخص کے رویہ اور حیثیت کے مطابق اس پر ظلم ھوا ۔ اپنے علم کی بنا پر کہہ سکتا ھوں کہ انگریزی سپاھیوں کو حکم یہ تھا کہ جو شخص اطاعت قبول کرے اس کے قتل سے ھاتھ اٹھائیں اور صرف اس کو لوٹ لینے ھی پر اکتفا کریں ۔ مگر جو شخص مقابلہ کرے اس کو قتل کر دیں ۔ اور اس کا گھر بار لوٹ لیں ۔ اب جو لوگ مارے گئے ان پر یہی گمان کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے سرتابی کی ھوگی ۔ مشہور بھی یہی ہے کہ انگریزی سپاہ نے زیادہ ترلوگوں کا مال و متاع لوٹ لیا مگر ان کی جانوں کو کوئی گزند نہیں پہنچایا ۔ لیکن کہیں کہیں ایک دو محلوں میں ایسا بھی ھوا کہ لوگوں

کو قتل بھی کیا گیا اور ان کا مال و اسباب بھی لوٹ لیا گیا ۔ لیکن بوڑھوں ، بچوں اور عورتوں کے قتل سے ہمیشہ پرہیز کیا گیا ، اس کے مقابلے میں اہل انصاف ہندوستانیوں کا برتاؤ یاد کریں ۔ بتلائیں کہ ایسی صورت میں جبکہ دشمنی اور کینہ پروری کی کوئی معقول وجہ موجود نہ ہو اور آقا کشی گناہ خیال کی جاتی ہو ۔ اپنے آقا پر تلوار کھینچنا اور بے گناہ عورتوں اور شیر خوار بچوں کو قتل کرنا کہاں تک قرین انصاف ہے ۔ برخلاف اس کے انگریزوں کے طرز عمل پر غور کیجیے کہ دشمنوں سے انتقام لینے اور مجرموں کو سزا دینے کی غرض سے کھڑے ہوئے ہیں ۔ اہل شہر سے بے حد بد دل اور ناراض ہیں اس پر بھی غلبہ پانے کے بعد جبکہ دلی کے کتے بلی کو بھی زندہ نہ چھوڑنا چاہیے تھا وہ غصہ کو ضبط کرتے ہیں ۔ عورتوں اور بچوں کو ہاتھ نہیں لگاتے ، بے قصور اور قصور وار میں پورا پورا فرق کرتے ہیں اور کسی شخص کو سوائے ان لوگوں کے جن کو باز پرس کے واسطے بلاتے ہیں پریشان نہیں کرتے ۔ اہل شہر میں سے بہت سے شہر بدر کر دیئے گئے ۔ جو باقی ہیں امید و بیم کی حالت میں ہیں ۔

۱۷ اکتوبر چہار شنبہ کے روز شہر میں اکیس توپوں کی سلامی ہوئی ۔ حیرانی ہوئی کہ لیفٹیننٹ گورنر بہادر کی آمد پر ۱۹ توپوں کی سلامی اترتی ہے۔ ۲۱ توپوں کی سلامی چہ معنی دارد ۔ کسی سے کچھ نہ معلوم ہو سکا گمان غالب یہ ہے کہ غالباً سپاہ انگریزی کو کسی مقام پر باغیوں پر کوئی زبردست فتح حاصل ہوئی ہے ۔

باغیوں کے زیر اثر مقامات ۔

اگرچہ دھلی میں فتنہ فرو ہو گیا مگر ابھی بد کردار باغیوں نے ایک طرف بریلی، فرخ آباد اور لکھنؤ میں شورش برپا کی ہے اور دوسری طرف سوھنہ اور میوات کے علاقہ میں فتنہ کی آگ بھڑکا رکھی ہے ۔ تلا رام نامی ایک شخص نے کچھ دنوں ریواڑی میں شورش برپا کی پھر دیو یا میو کے ساتھ مل کر میوات کے پہاڑ اور جنگلات میں انگریزوں کے مقابلہ کے لئے آمادہ ہوا۔

نواح دهلی کے رئیسوں کا قلعہ میں اجتماع ۔

جس ہفتہ میں انگریزی سپاہ نے شہر پر قبضہ کیا ۔ اسی ہفتہ میں امین‌الدین احمد خان بہادر و ضیاءالدین احمد خان بہادر اپنے اہل و عیال کے ساتھ تین ہاتھی اور چالیس تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنی جاگیر لوہارو کی طرف روانہ ہوئے ۔ مہرولی پہنچ کر ایک دو روز قیام کیا ۔ دوران قیام میں لشکریان غارت گران پر آن پڑے اور جو کچھ پاس تھا ۔ لوٹ کر لے گئے ۔ چنانچہ بے سر و سامانی کی حالت میں یہ روسائے ذیشان دوجانہ کی طرف روانہ ہوئے ۔ احسن علی خان بہادر والی دوجانہ نے نہایت مہربانی اور فیاضی سے حق مہمان نوازی ادا کیا ۔ جب صاحب کمشنر بہادر کو خبر ہوئی تو بلایا ۔ چنانچہ وہ رؤسائے آسمان شان پھر جانب دہلی روانہ ہوئے ۔ صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچے اور آداب بجا لائے ۔ صاحب بہادر نے طنز آمیز گفتگو شروع کی ۔ لیکن جب نرم اور نادمانہ و مصالحانہ جواب سنا تو خاموش رہے اور قلعہ میں قیام کرنے کی اجازت دی ۔ دو تین روز بعد حکم ہوا کہ عبدالرحمٰن خان والی جھجر کو گرفتار کر لائیں جب وہ رئیس والا شان وارد دہلی ہوا تو اس کو قلعہ میں دیوان عام میں ایک طرف قیام کرنے کا حکم ہوا اور اس کی تمام ریاست انگریزی علاقہ میں شامل کر لی گئی ۔ اس طرح ۳۰ اکتوبر جمعہ کے روز احمد علی خان والی فرخ نگر کو گرفتار کرکے دہلی لائے اور قلعہ میں ایک علیحدہ جگہ اتارا ۔ ۲ نومبر شنبہ کے روز بہادر جنگ خان والی بہادر گڑھ کو دہلی لایا گیا اور اس کے واسطے بھی قلعہ ہی میں جائے قیام مقرر ہوئی ۔ اسی طرح بروز شنبہ راجہ ناہر سنگھ والی بلب گڑھ بھی قلعہ میں لائے گئے ۔ نواح دہلی میں سات ریاستیں دہلی کی اجنٹی سے متعلق ہیں ۔ جھجر ۔ بہادر گڑھ ۔ بلب گڑھ ۔ لوہارو ۔ فرخ نگر ۔ دوجانہ ۔ اور پاٹودی ۔ ان سات ریاستوں میں سے پانچ ریاستوں کے رئیس اس وقت قلعہ میں جدا جدا جگہ پر مقیم تھے ۔ پاٹودی ، اور دوجانہ کے رئیس ، اپنی اپنی ریاستوں میں خوف زدہ سکتہ کے عالم میں منتظر تھے کہ دیکھیے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے ۔

انہی ایام میں مظفرالدولہ ، سیف الدین حیدر خان اور ذوالفقار الدین حیدر خان بھی

اپنے متعلقین کے ساتھ شہر سے نکل کھڑے ہوئے اور اپنے بھرے بھتو لے گھر لوٹ کے حوالے کر گئے ۔ شہزادگان خاندان تیموری میں سے کچھ لڑائی میں مارے گئے ۔کچھ گرفتار ہو کر قید خانوں میں پڑے ہوئے اپنے دن پورے کرتے ہیں ۔ معدودے چند ایسے تھے جو جان بچا کر بھاگ گئے ضعیف‌العمر بادشاہ کی گرفتاری کا حکم صادر ہے کہ باز پرس کی جائے ۔ والیان جھجر ۔ بلب گڑھ اور فرخ نگر کو علیحدہ مختلف اوقات میں پھانسی دیدی گئی ۔

حکیم محمود خان صاحب اور ساٹھ اور آدمیوں کو حوالات ۔

۱۸۵۸ء کے آغاز میں جنوری کے مہینہ میں ہندوستانیوں کی خطائیں معاف ہوئیں اور لوگ پھر شہر میں واپس آنے لگے ۔ اسی اثناء میں حاکم شہر کو چغلخوروں نے خبر دی کہ راجہ نرندر سنگھ بہادر کے معالج یعنی حکیم محمود خاں صاحب کا مکان مسلمانوں کے لیے جائے پناہ بنا ہوا ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایک دو باغی بھی ان لوگوں میں ہوں جو حکیم صاحب کے ہاں پناہ گزیں تھے چنانچہ ۲ فروری شنبہ کے روز حاکم مذکور دوڑ لے کر آ گیا اور مالک خانہ کو مع ساٹھ اور آدمیوں کے پکڑ کر لے گیا ۔ اگرچہ چند روز تک سب کو حوالات رہی لیکن حکیم صاحب کی عزت و آبرو کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ۔

بالاخر حکیم محمود خاں حکیم مرتضیٰ خاں اور ان کے چچا زاد بھائی حکیم عبدالحکیم خاں کو واپسی کی اجازت ہو گئی ۔ ۱۲ فروری کو کچھ لوگ اور چھوڑ دیئے گئے ۔ ۱۳ فروری کو تین آدمیوں نے اور رہائی پائی مگر نصف سے زائد آدمی حوالات ہی میں رہے ۔

لکھنؤ میں لڑائی اور شہر پر قبضہ ۔

اس ماہ میں سر جان لارنس صاحب چیف کمشنر بہادر کی آمد آمد کی خبر شہر میں گرم ہوئی اور ۲۰ فروری شنبہ کے روز شام کے وقت ۲۱ توپوں کی سلامی سے سارا شہر گونج اٹھا ۔ دوسرے دن صبح کو معلوم ہوا کہ شہر لکھنؤ فتح ہو گیا ۔ ساتھ ہی یہ بھی سنا کہ لکھنؤ میں ۱۴ فروری کو کمانڈر انچیف بہادر نے نہایت بہادری کے ساتھ

باغیوں پر ایک ایسا سخت حملہ کیا کہ انکے دھوئیں اڑا دیئے دوسرے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ یہ توپیں لکھنؤ کی فتح کی سلامی نہ تھی بلکہ سپاہ انگریزی کو باغیوں پر جو نمایاں غلبہ حاصل ہوا ہے ۔ اس کی خوشی میں چھوڑی گئی تھیں چوبیس فروری چہار شنبہ کے روز صبح کے وقت صاحب چیف کمشنر بہادر کا دھلی میں ورود ہوا ۔ ۱۳ توپوں کی سلامی ہوئی اور اہل شہر کے تن مردہ میں جان آئی ۔

ع
درکا لبد شہر روان باز آمد
فرمان فرمائے شہ نشان باز آمد
زیں شاہی و خوشدلی کہ روداد بہ شہر
گوئی کہ مگر شاہجہاں باز آمد

۲۷ فروری شنبہ کے روز اس رحمدل حاکم نے فریادیوں کی داد رسی کی اور امن و امان کا مثردہ سنایا۔

اہل دھلی کے مصائب ۔

آج کل قید خانہ شہر کے باہر اور حوالات شہر کے اندر ہے ان میں قیدیوں کا وہ ھجوم ہے کہ الامان و الحفیظ ۔ ان کے علاوہ جو لوگ پھانسی چڑھ گئے انکی تعداد خدا ہی خوب جانتا ہے ۔ آج کل دھلی میں مسلمان ہزار آدمیوں سے زیادہ نہ ہوں گے ۔ گرو ھا گروہ کلمہ گو شہر سے نکل کر دو دو تین تین کوس پرے کھنڈرات میں، ویرانوں میں ۔ پہاڑ کے کھنڈانوں میں زندگی کے دن پورے کرتے ہیں جو لوگ شہر میں باقی رہ گئے ہیں، ان میں یا تو قیدیوں کے عزیز و اقرباء ہیں اور یا پنشن خوران سرکار ہیں ۔

باغیوں کا ہر جگہ قلع قمع ۔

اٹھارہ مارچ بروز پنجشنبہ شام کے وقت گردوں شگاف توپوں کی آواز نے خبر دی کہ لکھنؤ میں کامل طور پر انگریزی تسلط ہو گیا ۔ اپریل کے مہینہ میں حکیم محمود خاں صاحب کے ساتھیوں نے جو اس وقت تک

حوالات میں تھے ۔ رھائی پالی اور حکیم صاحب اپنے عزیز و اقرباء کے ساتھ پٹیالہ کی طرف روانہ ہوئے ۔ مئی کے شروع میں خبر آئی کہ انگریزی سپاہ نے مراد آباد باغیوں سے خالی کرا لیا اور فتح کے بعد مراد آباد نواب یوسف علی خان صاحب والی رامپور کی قلمرو میں شامل کیا گیا ۔ اسکے بعد انگریزوں نے بریلی کو فتنہ پرواز باغیوں سے خالی کیا چنانچہ اب قوی امید ہے کہ عنقریب انگریزی سپاہ ہر جگہ باغیوں کا قلع قمع کر دیگی ۔ اور پھر تمام ھندوستان از سر نو سرکار انگریزی کے سایہٴ عدل و انصاف میں آ جائے گا ۔

۱۳ جون یکشنبہ کے روز شام کے وقت بہادر جنگ خان والی بہادر گڑھ کو بلا کر حکم جاں بخشی سنایا گیا اور ساتھ ھی ایک ہزار روپئے ماھوار وظیفہ کا مثردہ دیا گیا ۔

۲۲ جون کو ۲۱ توپوں کی سلامی نے خبر دی کہ انگریزی سپاہ کی جانبازانہ کوششوں سے گوالیار اور قلعہ گوالیار فتح ھو گیا ۔ جسکی مختصر روداد یہ ہے کہ باغیان سرکش دیگر مقامات کی طرح گوالیار پر قابض ھو گئے تھے ۔ راجہ گوالیار مہاراجہ جیا جی راؤ شہر اور شہریاری چھوڑ کر آگرہ بھاگ گیا ۔ اور انگریزوں سے مدد مانگی ۔ انگریزوں نے ایک جرار فوج سے اسکی مدد کی ۔ چنانچہ راجہ نے انگریزی فوج کی مدد سے باغیوں کو شکست فاش دی ۔

باغیوں کا حشر ۔

باغیوں کا جو کچھ حشر ھوا وہ ان کے کردار کی کافی سزا تھی ۔ یہ گمراہ سرکش ہر طرف سے ہزیمت پا کر گوالیار پہنچے ۔ لیکن جب وھاں بھی شکست فاش کھائی تو مدت تک رواں دواں پھرتے رہے اور رہزنی اور ڈاکہ زنی کرتے پھرے آخر کار ہر جگہ نہایت ذلت و خواری کے ساتھ ایک ایک کر کے مارے گئے ۔

انتخاب کلام غالب

(غیر مروجہ کلام سے)

گدائے طاقت تقریر ہے زباں تجھ سے ۔ کہ خاموشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

فسردگی میں ہے فریاد بیدلاں تجھ سے ۔ چراغ صبح و گل موسم خزاں تجھ سے

بہار حیرت نظارہ سخت جانی ہے ۔ حنائے پائے اجل ، خون کشتگاں تجھ سے

پری بشیشہ و عکس رخ اندر آئینہ ۔ نگاہ حیرت مشاطہ ، خوں فشاں تجھ سے

طراوت سحر ایجادی اثر یک سو ۔ بہار نالہ و رنگینئی فغاں تجھ سے

چمن چمن گل آئینہ در کنار ہوس ۔ امید ، محو تماشائے گلستاں تجھ سے

نیاز ، پردہ اظہار خود پرستی ہے ۔ جبین سجدہ فشاں تجھ سے ، آستاں تجھ سے

بہانہ جوی رحمت ، کمیں گر تقریب ۔ وفائے حوصلہ و رنج امتحاں تجھ سے

اسد طلسم قفس میں رہے قیامت ہے
خرام تجھ سے ، صبا تجھ سے ، گلستاں تجھ سے

بے دماغ خجلت ہوں ، رشک امتحاں تاکے
ایک بیکسی تجھ کو عالم آشنا پایا

ہے نگیں کی پاداری ، نام صاحب خانہ
ہم سے تیرے کوچے نے ، نقش مدعا پایا

جوہر ایجاد خط سبز ہے ، خود بینئ حسن
جو نہ دیکھا تھا سو آئینے میں پنہاں نکلا

دیدہ تادل ہے یک آئینہ چراغاں ، کس نے
خلوت ناز پہ پیرایہ محفل باندھا ؟

اسد یہ عجزو بیسامانئ فرعون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے دعویٰ ہے خدائی کا

ملی نہ وسعت جولان یک جنون ہم کو
عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا

مرا شمول ہر اک دل کے پیچ‌وتاب میں ہے
میں مدعا ہوں تپش نامۂ تمنا کا

نگاہ‌چشم حاسد وام لے اے ذوق خودبینی
تماشائی ہوں وحدت خانۂ آئینہ دل کا

اے آہ میری خاطر وابستہ کے سوا
دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

ہر چند ہوں میں طوطئ شیریں سخن ولے
آئینہ کوئی میرے مقابل نہیں رہا

شکوۂ یاراں غبار دل میں پنہاں کر دیا
غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

نہ بخشی فرصت یک شبنمستاں جلوۂ خور نے
تصور نے کیا ساماں ہزار آئینہ بندی کا

حسرت انداز رہبر ہے عناں گیر اے اسد　نقش پائے خضریاں صد سکندر ہو گیا

جنون آئینہ مشتاق یک تماشا ہے　ہمارے صفحے پہ بال پری سے مسطر کھینچ
کس بات پہ مغرور ہے اے عجز تمنا　سامان دعا وحشت و تاثیر دعا ہیچ

ہلاک بیخبری نغمہ وجود و عدم　جہان و اہل جہاں سے جہاں جہاں فریاد

دیوانے ، جز آمد و رفت نفس نہیں　ہے کوچہ ہائے نے میں غبار صدا بلند

چشم ہے خون دل و دل تہی از جوش نگہ　بزباں عرض فسون ہوس گل تاچند ؟
بزم داغ طرب و باغ کشاد پررنگ　شمع وگل تاکے و پروانہ و بلبل تاچند ؟

اے چرخ خاک برسر تعمیر کائینات　لیکن بنائے عہد وفا استوار تر

سادگیؐ یک خیال ، شوخیٔ صدرنگ نقش　حیرت آئینہ ہے جیب تامل ہنوز

ہیں میری مشت خاک سے اسکو کدورتیں　پائی جگہ بھی دل میں تو ہو کر غبار،حیف

برہم ہے بزم غنچہ ، بیک جنبش نشاط　کاشانہ بسکہ تنگ ہے غافل ہوا نہ مانگ

یک بخت اوج ، نذر سبکباریؐ اسد　سر پر ، وبال سایۂ بال ہما نہ مانگ

بقدر حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم

کرنے نہ پائے ضعف سے شور جنوں اسد اب کے بہار کا یونہی گذرا برس تمام

غالب، ہے رتبہ فہم تصور سے کچھ پرے ہے عجز بندگی جو علی کو خدا کہوں

گل غنچگی میں غرقۂ دریائے رنگ ہے اے آگہی فریب تماشا کہاں نہیں

فتادگی میں قدم استور رکھتے ھیں برنگ جادہ سر کوئے یار رکھتے ھیں
نگاہ دیدۂ نقش قدم ہے جادۂ راہ گذشتگاں اثر انتظار رکھتے ھیں

کوئی آگاہ نہیں باطن ہم دیگر سے ہے ہر اک فرد جہاں میں ورق نا خواندہ

ہستی فریب نامۂ موج سراب ہے یک عمر ناز شوخی عنوان اٹھائیے

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد اے گردش گردوں دوں وہ بھی

اسد اٹھنا قیامت کا قامتوں کا وقت آرائش
لباس نظم میں بالیدن مضمون عالی ہے

اسد بہار تماشائے گلستان حیات
وصال لالہ عذاران سرو قامت ہے

تمثال جلوہ عرض کر اے حسن کب تلک
آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی

یا رب ہمیں خیال میں بھی مت دیکھائیو
یہ محشر خیال کہ دلیا کہیں جسے

حیرت حجاب جلوہ و وحشت غبار چشم پائے نظر بدامن صحرا نہ کھینچئے
واماندگی بہانہ و دلبستگی فریب درد طلب بہ آبلۂ پا نہ کھینچئے

خراب نالۂ بلبل ، شہید خندہ گل ہنوز دعوئ تمکین و بیم رسوائی
ہزار قافلہ آرزو ، بیاباں مرگ ہنور محمل حسرت بدوش خودرائی
وداع حوصلہ ، توفیق سجدہ ، عجزوفا اسد ، ہنوز گمان غرور دانائی

آشنا، غالب نہیں ہیں درد دل کے آشنا ورنہ کس کو میرے افسانے کی تاب استماع

کون گل سے ضعف وخاموشی بلبل کہہ سکے نے وهاں غنچہ گویا نے زبان خار باغ

گل غنچگی میں غرقۂ دریائے رنگ ہے اے آ گہی فریب تمنا کہاں نہیں

خیال سادگیہائے تصور نقش حیرت ہے پر عنقا پہ رنگ رفتہ سے کھینچی ہیں تصویریں

وہ دل، جوں شمع بہر دعوت نظارہ لا، یعنی نگہ لبریز اشک و سینہ معمور تمنا ہو

اسد، جمعیت دل، درکنار بیخودی خوشتر دوعالم آگہی، سامان یک خواب پریشاں ہے

جادو ہے، یار کی روش گفتگو اسد یاں جز فسوں نہیں اگر افسانہ چاہئے

شوخیٔ اظہار، غیراز وحشت مجنوں نہیں لیلیٔ معنی اسد محمل نشین راز ہے

نہاں ہے گوہر مقصود، جیب خود شناسی میں کہ ہاں غواص ہے تمثال اور آئینہ دریا ہے

عبرت طلب ہے حل معمائی آگہی شبنم ، گداز آئینۂ اعتبار ہے

رشک ہے آسائش ارباب غفلت پر اسد پیچ و تاب دل نصیب خاطر احباب ہے

اے غنچۂ تمنا ، یعنی کف نگاریں دل دے تو ہم بتادیں مٹھی میں تیری کیا ہے

طلسم آئینہ، ، زانوئے فکر ہے ، غافل ہنوز حسن کو ہے سعئی جلوہ اندوزی

ہے عرض جوہر خد و خال ہزار عکس لیکن ہنوز دامن آئینہ پاک ہے

اس بیاباں میں گرفتار جنوں ہوں کہ جہاں موجۂ الگ سے ، دل پائے بزنجیر آوے

زنداں تصور میں، مہماں تغافل ہیں بیفائدہ یاروں کو فرق غم و شادی ہے

ذرہ دے مجنوں کے کس کس داغ کو پرواز عرض؟ ہر بیاباں، یک بیاباں حسرت تعمیر ہے

برہن ضبط ہے آئینہ بندئی گوہر و گر نہ بحر میں ہر قطرہ چشم پر نم ہے

شمع آسا، چہ سر دعویٰ و کو پائے ثبات ؟ کل صد شعلہ، بیک جیب شکیبائی ہے

برنگ گل، اگر شیرازہ بند بیخودی رہئے ہزار آشفتگی، مجموعۂ یک خواب ہو جائے

دود چراغ محفل

(انور غالب)

شاعر عہد آفریں

(۱)

غالب نکتہ سرا ، اے شاعر عہد آفریں
ہے بلند افلاک سے تیرے تخیل کی زمیں
شاہد نیرنگی معنی تری فکر حسیں
نکتہ باز و نکتہ ساز و نکتہ سنج و نکتہ چیں
تیرا حصہ ہے یہ حسن طرز و انداز سخن
روکش آہنگ نغمہ ہے ترا ساز سخن

(۲)

صدر بزم شورش دل میر آشفتہ سری
تو نے کی الفاظ میں احساس کی صورت گری
وہ دکھائی بات میں طرز ادا کی دلبری
باور آیا "شاعری جز و یست از پیغمبری"
تا حد امکان رسائی فکر کی لاریب تھی
شامل افکار تائید سروش غیب تھی

(۳)

ہے تری ایجاد خوئے ژرف بینی شعر میں
تو نے بخشا ذوق جدت آفرینی شعر میں
آ گئی تجھ سے ادائے نازنینی شعر میں
اہل فن کرتے ہیں تیری خوشہ چینی شعر میں
تیرے دل کی وحشتیں زیب دبستاں ہو گئیں
بلبلیں سن کر ترے نالے غزلخواں ہو گئیں

(۴)

شاہراہ عام سے تیری وہ کم آمیزیاں
فکر کی رعنائیاں جذبے کی شعلہ خیزیاں

شوق کی ویرانیاں غم کی جنوں انگیزیاں
لفظ کے پردے میں معنی کی جواہر ریزیاں

زندگی کو جب ترا نغمہ سنائی دے گیا
جزو میں کل ، قطرے میں دجلہ دکھائی دے گیا

(۵)

تیرا مسلک تھا کڑی راہوں پہ چلنا چاہیے
دامن گل شعلۂ شبنم سے جلنا چاہیے

منزل قید تعین کو بدلنا چاہیے
زندگی کو وقت سے آگے نکلنا چاہیے

اس لیے رفتار ماہ و سال پر قادر ہے تو
اک صدی گزری ہے لیکن آج کا شاعر ہے تو

(۶)

پر تو فصل بہاراں تیرا دیوان سخن
غمگسار دلفگاراں تیرا دیوان سخن

انبساط بزم یاراں ترا دیوان سخن
زیب آغوش نگاراں تیرا دیوان سخن

آئینہ رنگ سخن میں لذت تقریر کا
لفظ فریادی ہے تیری شوخی تحریر کا

(۷)

مرحبا اے سبزراہ خوش نوایان چمن
تیرا سینہ گلفروش شوخی داغ کہن
ہے رہین خون دل گلرنگیٔ مینائے فن
تو حریف بادۂ مرد افگن شعر و سخن
شاعری غم دوستی ہے ، شغل بیکاری نہیں
یہ سخن فہمی ہے غالب کی طرفداری نہیں

غزل

حسن کی طالب نگاہیں ، دل تمنا آشنا
زندگی لائی ہے اپنے ساتھ کیا کیا آشنا

حسنِ گل میں ہو کہ شعلے میں تڑپ اٹھتا ہے دل
تم نے باندھا ہے مرے دامن سے اچھا آشنا

دوستوں تک ہی خلوص دل اثر رکھتا نہیں
دشمنوں میں لوگ کر لیتے ہیں پیدا آشنا

خواب ہو کر رہ گئی ہیں کیسی کیسی صحبتیں
داغ فرقت دے گیا ہے کیسا کیسا آشنا

جیسی نیت ویسا پھل ، جیسی طلب ویسی مراد
ایک صف میں ہیں وہاں کیا اجنبی کیا آشنا

روز بن جاتا ہے اُن کا حسن موضوع کلام
اک قیامت روز کر دیتے ہیں برپا آشنا

جانے اُس محفل میں کتنے دوست ہیں کتنے حریف
ہم مگر انکی طبیعت سے ہیں تنہا آشنا

انکی محفل میں مری بربادیوں پر تبصرے
اور اُس دہلیز سے ہیں آج تک نا آشنا

کس طرف جائیں کہاں نکلیں کہ تو رسوا نہ ہو
ہم تو دیوانے ہیں دیوانوں سے دنیا آشنا

حشر سے ڈرتے ہو دانش بزم دنیا سے ڈرو
نفسی نفسی ہے یہاں بھی کون کس کا آشنا

غزل

(نذر غالب)

میرا ذوق دید ، تیرا روئے زیبا جل گیا
کیا بتاؤں ، دشت تنہائی میں کیا کیا جل گیا

اپنے جلووں کو غرور کبریائی سے نہ دیکھ
اپنی حد سے بڑھ کے جب چمکا ستارا ، جل گیا

بسکہ مشکل ہے جہنم زار دل میں جھانکنا
لوگ کہہ دیتے ہیں ، بے چارے کا چہرہ جل گیا

روح کی حدت میں جل بجھ کر بھی ، میرے جسم میں
وہ قیامت کی تپش تھی ، دست عیسیٰ جل گیا

پیاس کیا بجھی کہ صحرا کا تھا منظر سامنے
دھوپ اتنی تیز نکلی ، رنگ دریا جل گیا

اب تو ذرے بس سے باہر ہیں ، ستارے پاس ہیں
آگ وہ برسی کہ سب معیار اشیا جل گیا

درس آداب محبت میں کٹی عمر عزیز
وہ دیا ہوں میں جو اس تربت پہ تنہا جل گیا

غزل

غم حیات سے یوں تو کسے فراغت ہے
جو یاد یار میں گزرے وہ دم غنیمت ہے

بہت گریز نہ کر، جانے کوئی کیا جانے
نہیں ہے تجھکو محبت ، مگر محبت ہے

ترے خیال نے جس دن سے ساتھ چھوڑ دیا
میں اپنے ساتھ ہوں ، یہ بھی بڑی رفاقت ہے

یہ کہہ کے مجھکو بلاتی ہیں شہر کی گلیاں
جنوں میں دھشت نوردی کی کیا ضرورت ہے

یہ ماوریٰ مرے احساس ہی کا عکس نہ ہو
کہ میرا عالم احساس اک حقیقت ہے

نہ وقت ہے نہ مکاں ، اک فقط مرا احساس
سو وہ بھی کیا ہے ترے حسن کی شہادت ہے

وہ پاس آئے تو کچھ اور بڑھ گئی دوری
اب ان کو پا کے انہیں جاننے کی حسرت ہے

غزل

سوائے آب گہر بحر و بر میں خاک نہیں
نظر نہیں ہے تو آب گہر میں خاک نہیں

ہماری خانہ خرابی کے دیکھئے ساماں
بلا رہے ہیں انہیں اور گھر میں خاک نہیں

ہوئی ہے ہم نفس ہوئے گل سر را ہے
و گر نہ دامن یاد سحر میں خاک نہیں

پہنچ کے منزل مقصود پر بھی راہ میں ہیں
سوائے گرد سفر اپنے سر میں خاک نہیں

ہیں اپنے دور میں دیوانگی کے طور کچھ اور
کہ جیب چاک نہیں اور سر میں خاک نہیں

الجھ رہا ہے کبھی خود سے گاہ انجم سے
سوائے فتنہ ضمیر بشر میں خاک نہیں

غزل

امید نہ کوئی دل بیمار میں آوے
ممکن ہے کمی صبح کے آثار میں آوے
اس بار سنبھل جاؤں تو پھر جو بھی گزر جائے
کافر ہو اگر کوچۂ دلدار میں آوے
منصور کو معلوم اگر ہوتا نہ مرتا
وہ لطف کہ خواب رسن و دار میں آوے
در گزرے نہ کیوں باغ سے، کیوں دشت نہ ڈھونڈے
جس پاؤں کو لذت خلش خار میں آوے
دیکھو مجھے، عبرت کا مرقع ہوں کہ جس کو
جینے کا مزہ صحبت اغیار میں آوے
بلبل تھی سو اس کو بھی ہوا حکم کہ اب سے
شبنم کی طرح آوے جو گلزار میں آوے
اس آس میں اک عمر سے میں رہن غزل ہوں
ممکن ہے یہ غم معرض اظہار میں آوے
اک سوت کی انٹی بھی نہ قیمت کوئی ڈالے
یوسف بھی جو اس شہر کے بازار میں آوے
تا حشر نکلنے کی کوئی راہ نہ نکلے
گر خضر بھی اس دشت پر اسرار میں آوے
جز خاک پریشاں نظر آوے گا نہ شہرت
سورج بھی جو اس سایۂ دیوار میں آوے

غزل

راھوں کے اونچ نیچ ذرا دیکھ بھال کے
ھاں رھرو مراد قدم رکھ سنبھال کے

فتنوں کو دیکھ ، اپنے قدم روک ، بیٹھ جا
راتیں یہ آفتوں کی ھیں یہ دن وبال کے

[illegible] سر گراں تھا ھجر کی راتوں کے قرض سے
مایوس ھو کے لوٹ گئے دن وصال کے

کچھ یہ نہ تھا کہ میں نے نہ سمجھی بساط دھر
میں خود ھی کھیل ھار گیا دیکھ بھال کے

سامان دل کو بے سرو سامانیاں ملیں
کچھ اور بھی جواب تھے میرے سوال کے

دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سو آپ کا
دل لیجئے مگر میرے ارمان نکال کے

غزل

خیال جلوۂ جاناں میں جو خراب رہا
جمالِ کون و مکاں اس کے ہمرکاب رہا

کبھی نہ مطلعِ ذہنِ بشر کو دیکھا صاف
ہمیشہ اس پہ کسی خواب کا سحاب رہا

ہماری سمت اٹھی جب کوئی نگاہ اٹھی
ہمیں سے ہر لبِ خوش تاب کا خطاب رہا

کبھی کبھی مجھے ہر ثروتِ وصال ملی
کبھی کبھی وہ مرے دل میں بے حساب رہا

نہ پوچھ ہجر کی شب اہلِ دل پہ کیا گزری
امید کا سوا نیزے پہ آفتاب رہا

غزل

بدلتا ہے زمانہ رنگ کیا کیا
جو تم ہو ساتھ تو اچھا برا کیا

نہ کچھ حاصل ہو جس سے التجا کیا
جو محروم اثر ہو وہ دعا کیا

وفا کے بھیس میں ان کی وفائیں
خدا جانے دکھائیں اور کیا کیا

تڑپ دل کی زیادہ ہو رہی ہے
وہ آئے پوچھنے کو مدعا کیا

نہیں اخلاص کی قیمت جہاں میں
کسی مجبور الفت کی وفا کیا

بدلتی جا رہی ہیں ان کی نظریں
کسی نا معتبر کا آسرا کیا

کہا کب ہم نے ان سے حال اپنا
پھر ان کی بے نیازی کا گلا کیا

بڑھایا کرب نے احساس راحت
نہ ہو رہزن تو قدر رہنما کیا

ملا وہ غم جو جان آرزو ہے
ہمیں پھر ہو مقدر سے گلا کیا

کنارہ کر رہے ہیں دوست دشمن
ہماری بیکسی کا پوچھنا کیا

ابھی تو ہے شروعات اسکی کسریٰ
دکھائے اور دور ابتلا کیا

غـزل

زهر نشاط فصل گذشتہ چشیدہ ہوں
ہر صبح میں بھی گل کی طرح آب دیدہ ہوں

میں نغمۂ بہار ہوں اے باد نو بہار!
ہر چند بوئے گل کی طرح ناشنیدہ ہوں

لیکر چراغ گل مجھے ڈھونڈا کرے صبا
میں چہرۂ بہار کا رنگ پریدہ ہوں

باد نسیم ہوں مجھے آوارگی ہے راس
کانٹا نہیں کہ گل کی طرح آرمیدہ ہوں

روندا گیا ہوں سبزۂ بیگانہ کی طرح
کس سے کہوں کہ میں بھی چمن آفریدہ ہوں

گوہر نہیں کہ ہر کس و ناکس خرید لے
میں چشم روزگار کا اشک چکیدہ ہوں

شعلہ ہوں میرا سر نہ جھکے گا کسی جگہ
فیضی اگرچہ بار الم سے خمیدہ ہوں

غزل

ہے آرزوئے عشق حسینان جہاں اور
سامانِ مکاں چند تصاویر بتاں اور

جتنا بھی کیا قصر تمنا میں چراغاں
اتنا ہی اٹھا سینۂ حسرت سے دھواں اور

جتنا بھی رخِ حسنِ یقیں غور سے دیکھا
تابندہ ہوئی سرخیٔ رخسارِ گماں اور

یا رب ترے فردوس میں صحرا کا نہیں نام
ہم اہل جنوں کے لئے لازم ہے جناں اور

یہ دل کے لئے آگ ، وہ دامن کے لئے آگ
غنچے کی زباں اور ہے شعلے کی زباں اور

محبوب کی بستی ہے کہ قاتل کا مکاں ہے
مہتاب ہے یا اک سرِ مقتل کا نشاں اور

تشویش نہ کر منزل کل مل کے رہے گی
مانا کہ ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

باز آئے ہیں الفت سے نہ باز آئیں گے افسر
ہونا ہے محبت میں ابھی جی کا زیاں اور

ق

غالب سا شہنشاہ غزل کوئی نہیں ہے
ہاں ، دوسری اصناف سخن میں ہیں شہاں اور

ایسا کہ سخن میں ہوں پیمبر کی سی باتیں
دکھلاؤ کوئی یوسفِ کنعانِ بیاں اور

ہو مومن و کافر کا جسے درد برابر
پیدا ہے کہاں صاحبِ دل ایسا یہاں اور

دیں جس کا ہو انسانیت ، ایمان وفا ہو
لے آؤ کوئی مجتہدِ فکرِ جواں اور

غالب کا سخن دہر میں غالب ہی رہے گا
ہونا ہے اسے باعثِ فیضانِ جہاں اور

اس دور میں اقسر کو غنیمت ہی سمجھیے
یہ جذبۂ اخلاص میسر ہے کہاں اور

غزل

وہ نگاہیں زندگی کا ساز و ساماں ہو گئیں
خود ہی بخشا درد دل اور خود ہی درماں ہو گئیں

آ گئی جب یاد ان کی دل میں مانند صبا
سب سکون دل کی شمعیں اس سے لرزاں ہو گئیں

ہم صفیرو لگ گیا کنج قفس میں اب تو جی
بجلیاں اب آشیاں سے کیوں گریزاں ہو گئیں

کیا خبر ان کو کہ ہے ضبط فغاں معراج عشق
ہمنشیں سمجھے دعائیں آن کی درماں ہو گئیں

بے خبر ہوں اپنی حالت کی خبر مجھ کو نہیں
روز و شب کی گردشیں سب مجھ پہ یکساں ہو گئیں

ہم نے دیکھا ہے چمن میں خونچکاں منظر عجب
پتیاں پھولوں کی ہر جانب پریشاں ہو گئیں

میرے نغموں نے دیا ہے ذوق نظارہ نسیم
حسن کی رعنائیاں ان سے نمایاں ہو گئیں

غالب کے قلم سے

اُردوئے معلیٰ کے ایک خط کے چند جملے

بنی کا ایک صاحب کے مکان سے اودھر

آیا ہوں بلّی ماروں کے محلّے میں ایک حویلی کرایہ کو لیکر اوسمیں رہتا ہوں وہ لکھا میرا رہنا
تخفیف کرایہ کے واسطے نہ تھا صرف کا ایک صاحب کی محبت سے رہتا تھا اوسکی اطلاع کے تم کو
لکھا ہے اگرچہ میرے خط پر حاجت مکان کے نشان کی نہیں ہے [illegible] العبد بهر صورت کافی ہے
مگر احتیاطاً کنوانی نہ لکھا کرو محلہ بلّی ماراں لکھا کرو اور ہاں صاحب ہمارے شفیق بابو [illegible] صاحب کا حال
لکھو مسہل سے فراغت ہو گئی اور مزاج کیسا ہے اور اب اجمیر [illegible] آئے یا نہیں
جا پہنچینگے میرا سلام بہیج کہہ دیجئیگا والسلام اسد اللہ [illegible] شنبہ [illegible]

خط ۹

کالجیات

کچھ اپنے بارے میں

جاوید احمد خان
(سال دوم)

ایک پاکیزہ تقریب

نوید اقبال
(سال دوم)

کچھ اپنے بارے میں

کہا جاتا ہے کہ افراد اہم نہیں ہوتے ادارے اہم ہوتے ہیں ہیں ۔ اس قول میں بڑی صداقت ہے مگر ادارے اپنی مخصوص روایات کی وجہ سے اہمیت اختیار کرتے ہیں اور روایات افراد کے ہاتھوں تشکیل پاتی ہیں ۔ اسلئے جب ہم کسی ادارے کا ذکر کرتے ہیں تو ان افراد کو نظر انداز کرنا بے انصافی ہے جنہوں نے اسے قائم کیا اور اسکی بنیادوں کو مستحکم کیا ۔ پھر ان لوگوں کا ذکر نہ کرنا بھی زیادتی ہے جو اسکے حال اور مستقبل کو درخشاں بنانے کی فکر میں ہوں ۔

ہمارا کالج ۱۹۵۷ء میں گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول کے نام سے قائم ہوا ۔ کالج کی اپنی عمارت نہ ہونے کی وجہ سے گلبرگ میں ایک کوٹھی کرائے پر لی گئی اور ڈاکٹر محمد یونس اپل اسکے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے ڈاکٹر صاحب اور اس کے وقت کے اساتذہ کی انتکھ محنت نے جلد ہی ان تمام مسائل پر قابو پا لیا جو نئے قائم ہونے والے ادارں کو در پیش ہوتے ہیں ۔ ڈاکٹر اپل کے بعد پروفیسر سید غلام رضا اس کالج کے سر براہ ہوئے ۔ ان کا ذکر ہمارے اس وقت کے اساتذہ آج تک عقیدت اور احترام سے کرتے ہیں پھر پروفیسر میاں محمد اسلم پرنسپل ہوئے وہ بھی اپنی شرافت طبع اور شفقت کے سبب ابھی تک ذہنوں سے فراموش نہیں ہوئے ۔ انکے بعد پروفیسر شیر احمد صاحب کو پرنسپل کا عہدہ تفویض ہوا ۔ شیخ صاحب حیوانیات کے پروفیسر تھے مگر علوم شرقیہ سے ان کا شغف اور ادب و شعر سے انکی دلچسپی نے کالج کی فضا پر بھی اثر ڈالا اور یہاں ان کے دوران قیام میں علمی اور ادبی ہنگامے گرم رہے اور ہماری محفلوں میں لاہور کے مشہور اہل قلم کے علاوہ جوش

ملیح آبادی جیسے شعرا اور قاضی عبدالودود (بھارت) جیسے اہل علم بھی شریک ہوئے ۔

اس دوران میں کالج نے جہاں ہر شعبے میں ترقی کی وہاں طلباء کی تعداد بھی بتدریج بڑھتی رہی ۔ گلبرگ کی کوٹھی بہر حال کوٹھی تھی اسلئے جگہ کی کمی کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا گیا ۔ کوٹھی کے پچھلے صحن میں کلاسوں کیلئے شامیانے لگائے گئے اور پوری کوشش کی گئی کہ جگہ کی کمی کا اثر تعلیم پر نہ پڑے ۔ شیخ شیر احمد صاحب کے بعد کیپٹن محمد رفیق طوسی صاحب بحیثیت پرنسپل تشریف لائے اور کئی سال تک کالج کیلئے مناسب جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے بالاخر پروفیسر خواجہ عبدالوحید صاحب کی سر براہی کے دوران یہ کالج موجودہ عمارت میں منتقل ہوا ۔ اس وقت عمارت زیر تعمیر تھی اور کمروں کے فرش دروازے اور کھڑکیاں تک نا مکمل تھے ۔ چند روز با قاعدگی سے کلاسیں بھی نہ ہو سکیں اور جگہ کی کمی، آمد و رفت کی دقت اور پانی اور بجلی وغیرہ کی غیر موجودگی نے تعلیم اور نظم و ضبط کے ماحول کو بھی متاثر کیا ۔ بہر حال جلد ہی ان مشکلات پر قابو پا لیا گیا مگر وہ فضا جو گلبرگ میں قائم ہوئی تھی ابھی تک لوٹ کر نہیں آ سکی ۔

خواجہ عبدالوحید صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے تمام مشکلات کے باوجود اس کالج کا نظم و نسق چلایا ۔ یہاں الکے قیام کی مدت سب سے طویل ہے اور عمارت کی تبدیلی کی وجہ سے جو مشکلات در پیش ہوئیں اور جو مسائل پیدا ہوئے انکی تعداد بھی سب سے زیادہ ہے ۔ موجودہ عمارت ابھی تک نا مکمل ہے ۔ لائبریری اور ہال کی عمارت موجود نہیں ہے ۔ کلاسوں کے لئے کمرے نا کافی ہیں ۔ طلباء کیلئے خالی وقت میں بیٹھنے یا مطالعہ کیلئے جگہ نہیں ہے ۔ ٹک شاپ کیلئے کوئی جگہ موجود نہیں ہے۔ ان تمام سہولتوں کی عدم موجودگی میں تعلیم اور نظم و نسق کے مسائل سے بخوبی عہدہ برا ہونا ہی معجزے سے کم نہیں ہے خواجہ عبدالوحید صاحب نے ان تمام مشکلات کے باوجود اس ادارہ کی روایات کو قائم رکھا ۔ ان کے زمانے

میں ھی طلباء کی تعداد اتنی بڑھ چکی تھی کہ موجودہ نا مکمل عمارت میں انہیں خاطر خواہ سہولتیں بہم پہنچانا نا ممکن ہو گیا ۔ الکے بعد پروفیسر اقبال احمد خان صاحب بحیثیت پرنسپل تشریف لائے ان کا قیام بہت مختصر رہا مگر طلباء کی تعداد بدستور بڑھتی رہی اور اب یہ تعداد آٹھ سو (۸۰۰) سے متجاوز ھے ۔

ان مسائل کی موجودگی میں پروفیسر حافظ منظورالحق عثمانی پاکستان کی عظیم درسگاہ گورنمنٹ کالج ۔ لاھور میں مکمل چودہ سال تدریسی خدمات سر انجام دینے کے بعد اس کالج میں بحیثیت پرنسپل تشریف لائے ھیں ۔ تمام اچھے استادوں کی طرح وہ طلباء کے مسائل کو اولیت دیتے ھیں اور پہلے ھی دن سے طلباء کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں اور آسائشیں بہم پہنچانے کے لئے کوشاں ھیں ۔ جگہ کی قلت سے نمٹنے کیلئے انہوں نے ھمسایہ کالج (سپریر سائنس کالج) کی عمارت میں کمرے حاصل کئے ھیں اور کالج میں طلباء کے بیٹھنے اور فارغ اوقات میں مطالعہ کیلئے مناسب جگہ کا انتظام کیا ھے ۔ اس بات پر خصوصی توجہ دی جا رھی ھے کہ فارغ وقت میں طلباء کلاسوں سے باھر برآمدوں وغیرہ میں جمع نہ ھوں ۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ کلاسوں میں بیٹھے ھوئے طلباء کی توجہ بٹتی ھے بلکہ باھر پھرنے والے طلباء کا بھی وقت ضائع ھوتا ہے ۔ فارغ وقت کو کارآمد بنانے کیلئے با قاعدہ SILENCE ZONE بنایا گیا ہے ۔ یہ علاقہ لائبریری، اس سے ملحقہ کمرے اور برآمدے پر مشتمل ہے ۔ کم و بیش ۲۰۰ طلباء کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا ہے اور ایسی سہولتیں بہم پہنچائی گئی ھیں کہ وہ اپنے خالی وقت میں لکھنے پڑھنے کا کام بہ آسانی یہاں بیٹھ کر کر سکتے ھیں ۔ ھر روز اساتذہ ''سائلنس زون،، کی نگرانی پر مقرر ھوتے ھیں ۔ جو طلباء یہاں مطالعہ میں مصروف ھوتے ھیں ان سے رھنمائی بھی حاصل کر سکتے ھیں اور اس علاقہ کو زیادہ مفید بنانے کیلئے ان حضرات کو تجاویز بھی پیش کر سکتے ھیں ۔

کالج میں علمی اور ادبی ماحول پیدا کرنے کی طرف بھی خصوصی توجہ دی جا رھی ہے ۔ پروفیسر عثمانی علم و ادب سے خاص شغف رکھتے ھیں وہ خود بھی ایک

اچھے ادیب ہیں اور فارسی کے مشہور مجلہ "ہلال" کے مدیر رہ چکے ہیں دبستان کا زیر نظر شمارہ انہی کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر حافظ منظورالحق عثمانی ہمارے کالج میں اس وقت تشریف لائے جب طلباء کے ہنگاموں کی وجہ سے ملک کے اکثر تعلیمی اداروں کی طرح ہمارے کالج میں بھی تعلیم و تدریس کا کام بند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک طلباء ان سے پوری طرح متعارف نہیں۔ ہمارے خیال میں طلباء کا اپنے اساتذہ سے پوری طرح متعارف ہونا اور انکے خالدانی اور تعلیمی پس منظر اور علمی مرتبہ سے واقف ہونا استاد اور شاگرد کے درمیان یگانگت کی ایسی فضا پیدا کرتا ہے جو خوشگوار تعلیمی ماحول پیدا کرنے کیلئے بہت ضروری ہے۔ یہی سبب تھا کہ میں اپنے نئے پرنسپل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنے متعلق کچھ سوالات کا جواب عطا فرمائیں۔ موصوف نے بڑی محبت اور فراخدلی سے میرے تمام سوالات کا جواب دیا ان جوابات کا خلاصہ میں "دبستان" کے قارئین کی نذر کر رہا ہوں:-

پرنسپل حافظ منظورالحق عثمانی کے والد کا اسم گرامی قاضی ظہورالحق عثمانی مرحوم ہے۔ آپ ۱۹۲۱ء میں پانی پت کے مردم خیز شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ پانی پت کے اس علم دوست خاندان کے چشم و چراغ ہیں جسمیں حضرت مخدوم جلال‌الدین کبیرالاولیاء اور حضرت قاضی ثناءاللہ (رح) محدث پانی پتی جیسی بزرگ ہستیاں ہوئی ہیں۔ آپ کے والد گرامی اپنے علاقہ کے ایک بڑے زمیندار اور میونسپل کمشنر تھے۔ آپ نے خاندانی روایات کے مطابق بچپن میں کلام پاک حفظ کیا اور دینی تعلیم کی تکمیل کی۔ پھر حالی مسلم ہائی سکول سے ۱۹۳۷ء میں میٹرک اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۴۱ء میں بی۔اے کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے اور ۱۹۴۳ء میں دہلی یونیورسٹی سے ایم۔اے فارسی کا امتحان پاس کیا۔ ایم۔اے فارسی میں آپ یونیورسٹی میں اول رہے۔ پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور علمی تشنگی بجھانے میں مصروف ہو گئے۔ وہیں سے آپ نے ۱۹۴۴ء میں بی۔ٹی اور ۱۹۴۶ء میں ایم۔اے اردو کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اور

گورنمنٹ کالج رہتک (مشرق پنجاب) میں اردو اور فارسی کے لکچرار مقرر ہوئے جہاں قیام پاکستان تک اردو فارسی پڑھاتے رہے - ۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ کالج ساہیوال اور اسکے ایک سال بعد گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں تبادلہ ہوا - ۱۹۴۹ء میں شاہنشاہ ایران پہلی بار پاکستان تشریف لائے اور انہوں نے حکومت پاکستان کو پیشکش کی کہ پاکستان کا ایک فاضل تہران یونیورسٹی میں تحقیق و تدریس کا کام کرے چنانچہ اس منصب کیلئے حکومت پاکستان نے پرنسپل حافظ منظورالحق عثمانی کو منتخب کیا - آپ ۱۹۵۰ء میں تہران تشریف لے گئے اور دو سال تک تہران یونیورسٹی کے چوٹی کے اساتذہ سے استفادہ کیا اور موجودہ فارسی ادب و تاریخ پر تحقیق کی - ۱۹۵۱ ء میں تہران سے تمام بلاد اسلامی کی سیاحت کو نکلے اور عراق، ترکی، مصر، شام، لبنان، اردن اور دیگر ممالک کے علمی ذخائر سے استفادہ کرنے کے بعد پاکستان واپس تشریف لائے - حکومت پاکستان نے آپکو فارسی کا ایک اعلیٰ میعاری رسالہ نکالنے پر مامور کیا - آپ نے ''ھلال،، کے نام سے اس وقیع مجلہ کا اجرا کیا اور دو سال کے مختصر عرصہ میں اسے ایران و افغانستان کے معیاری جرائد کی صف میں لے آئے - مدیر کی حیثیت سے آپ نے فارسی زبان میں بیش بہا مضامین لکھے جو ایران، افغانستان اور پاکستان کے علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے اور انہی مضامین کے سبب آپکا شمار فارسی زبان کے ممتاز ادیبوں میں ہونے لگا - اسی دوران آپ نے فارسی میں ''نظرے بپاکستان'' نام سے ایک کتاب لکھی جو ایران میں بیحد پسند کی گئی - ''ھلال'' کی ادارت کے سلسلہ میں آپکو کراچی میں قیام کرنا پڑا - یہاں کی آب و ہوا نے آپ کے اہل خاندان کی صحت پر برا اثر ڈالا اور دو سال کی انتھک محنت کی وجہ سے آپ سخت بیمار ہو گئے چنانچہ با دل ناخواستہ آپ نے ''ھلال،، کی ادارت کو خیر باد کہا اور محکمہ تعلیم میں لوٹ آئے - ۱۹۵۵ء میں آپ کا تقرر گورنمنٹ کالج لاہور میں ہوا - آپ ایک عرصہ تک کالج کی طرف سے پنجاب یونیورسٹی میں ایم - اے فارسی کی کلاسوں کو پڑھاتے رہے - فارسی کلاسیکی شاعری اور تصوف آپ کے خاص مضامین تھے - ۱۹۶۶ء میں آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ فارسی کے رئیس مقرر ہوئے - اس عظیم درسگاہ میں بحیثیت پروفیسر اور بحیثیت رئیس شعبہ فارسی آپ نے کم و بیش ۱۳ سال تک قابل قدر خدمات انجام دیں -

جنوری ۱۹۶۹ء میں پروفیسر حافظ منظورالحق عثمانی ہماری درسگاہ میں بحیثیت پرنسپل تشریف لائے ۔ آپ کی آمد اس درسگاہ کیلئے فال نیک ہے ۔ آپ اردو اور فارسی کے مستند ادیب اور علوم مشرقی کے عالم ہیں ۔ تعلیم و تدرس سے آپ کو فطری مناسبت ہے اور سیاحت آپکا محبوب مشغلہ ہے ۔ آپ نے نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کی سیاحت ۔ کی ہے اس شوق نے آپ کے علم کو وسیع کیا ہے اور حوصلہ کو بلند رکھا ہے ۔ چنانچہ پرنسپل موصوف اس کالج کے گوناگوں مسائل کے باوجود بلند عزائم رکھتے ہیں ۔ طلباء اور اساتذہ کے ساتھ انہیں جو ربط خاطر ہے اسکے پیش نظر وہ بہت جلد تمام مسائل اور مشکلات پر قابو پا لینگے ۔ ہماری دعا ہے کہ خدا ان کے عزائم پورے کرے :

★

عید میلادالنبیؐ



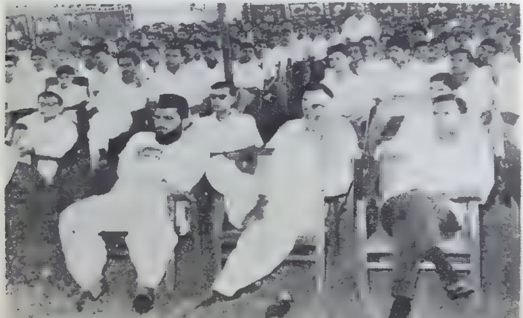
جسٹس بدیع الزماں کیکاؤس صدارت فرما رہے ہیں اور مولانا سیعد احمد اکبر آبادی تقریر کر رہے ہیں۔



سامعین میں ۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۔ ڈاکٹر وزیرالحسن عابدی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی
اگلی صف میں نظر آ رہے ہیں ۔



صدر مجلس جسٹس بدیع الزماں کیکاؤس خطاب فرما رہے ہیں ۔



سامعین کا ایک اور منظر

ایک پاکیزہ تقریب

عید میلاد کا دن دنیا کی تاریخ کا اہم ترین دن ہے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے ۔ آج کے دن دنیا میں وہ عظیم شخصیت تشریف لائی جس نے انسان کو صحیح معنوں میں انسانیت سے روشناس کیا ۔ انسانیت کے اس محسن آعظم کا یوم پیدائش منانے کے لئے ۳۰ مئی ۱۹۶۹ء بروز جمعہ ایک باوقار تقریب منعقد کی گئی ۔ کالج کے پرنسپل جناب حافظ منظورالحق عثمانی ایک مشہور صوفی اور عالم خاندان کے چشم و چراغ ھیں آپ کو رسول کریم کی ذات بابرکات سے جو تعلق خاطر ہے اسکا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے اس تقریب کے سلسلے کی تمام ذمہ‌داریاں خود سنبھالیں ۔ آپ ھی کے ذاتی تعلقات کی وجہ سے جناب جسٹس بدیع‌الزماں کیکاؤس ، جناب سعید اکبرآبادی (ڈین آف تھیالوجی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی) اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور دوسرے معزز مہمان تشریف لائے ۔

جلسہ کا آغاز جناب بدیع‌الزماں کیکاؤس کی صدارت میں ساڑھے آٹھ بجے صبح ھوا ۔ سٹیج سکریٹری کے فرائض جناب افسر حسین رضوی (استاد شعبہ اردو) نے سر انجام دیئے ۔ پہلے لاھور کے مشہور قاری جناب حافظ عبدالرحمن صاحب نے تلاوت کلام پاک سے حاضرین کے قلوب کو منور کیا ۔ تلاوت کے بعد کالج کے طالب علم طالب حسین صاحب سال دوم نے حمد باری تعالیٰ پیش کی ۔ انکے بعد میر تنویر صاحب (سال دوم) نے سرور کائنات کے حضور میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ۔ پھر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے حاضرین سے خطاب کیا ۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر بڑی موثر ، دلپزیر اور عام فہم تھی ۔

انکے پرخلوص انداز بیان نے حاضرین کو مسحور کر دیا ۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ رسول مقبول کی زندگی ہزار پہلو زندگی ھے ۔ دنیا میں بڑے جنرل ، مقرر ، سیاستدان ، مذہبی پیشوا ، فلسفی ، اور عالم گزرے ھیں مگر انکی زندگیاں یک پہلو تھیں ۔ جو فلسفی ھے وہ میدان جنگ، کا مرد نہیں ۔ جو صاحب سیف ھے وہ صاحب قلم نہیں جو معاشی مفکر ھیں انکو اخلاقیات سے واسطہ نہیں ۔ لیکن پیغمبر اسلام کی شخصیت ایسی جامع الصفات ہے کہ ہر بڑائی انکی ذات گرامی سے فروغ پاتی ھے شاعر نے کیا خوب کہا ھے کہ

آنچہ خوباں ھمہ دارند تو تنہا داری

ھمیں رسول کریم کی ذات میں تمام صفات یکجا نظر آتی ھیں ۔ ڈاکٹر اسرار صاحب نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پختگی کردار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ نے اپنے مشن کی کامیابی کے لئے انتھک جدوجہد کی ۔ اس سلسلے میں آپ کو مسلسل مصائب اور مشکلات کا سامنا رہا ۔ دنیا کے کسی مصلح اور کسی پیغمبر کو اس قدر مصائب برداشت نہیں کرنے پڑے جتنے رسول کریم کو درپیش آئے ۔ آپ کے کردار کی عظمت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ کسی بھی مرحلے پر آپکے پائے ثبات میں ذرا سی بھی لغرش نہ آنے پائی ۔ اور کسی بھی موقعہ پر آپکے دل میں مایوسی کا شائبہ تک نہ پیدا ہوا ۔ آپ نے نہایت پامردی سے تمام مصائب برداشت کئے اور بالاخر اپنے عظیم مقصد کو پا لیا ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کا دوسرا رخ اس وقت ھمیں نظر آتا ہے جب آپ کامیاب و کامران ہو کر مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور ان تمام لوگوں کو معاف کر دیا جو آپ کو زندگی بھر طرح طرح کی اذیتیں دیتے رہے ۔ آپ مکہ معظمہ میں عام فاتحین کے برعکس کسی قسم کے تکبر یا فخر و مباہات کے اظہار کے بجائے عجز و انکسار اور اظہار تشکر سے سر جھکا کر داخل ہوئے ۔

ڈاکٹر اسرار صاحب کے بعد مولانا سعید اکبر آبادی صاحب نے اپنے خیالات کا

اظہار فرمایا آپنے کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سراپا رحمت تھے جس طرح خداوند قدوس نے اپنے لئے رب العلمین کی صفت بیان فرمائی اسی طرح اپنے پیارے پیغمبر کو بھی ایسی ہی عظیم الشان صفت سے نوازا علامہ موصوف نے حضور کی مبارک زندگی کے مختلف واقعات کا ذکر کرتے ہوئے آپ کی اس صفت رحمت کو بیان کیا اور بتایا کہ آپ کس کس طرح اپنے احباب اور اغیار کے لئے ، چھوٹوں اور بڑوں کے لئے مردوں اور عورتوں کے لئے ، بچوں اور بوڑھوں کے لئے ، پرندوں اور چرندوں کے لئے یہاں تک کہ نباتات اور جمادات تک کے لئے بھی یکساں رحمت تھے ۔

آخر میں صدر جلسہ جناب جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس نے اپنے ارشادات عالیہ سے حاضرین کو نوازا اور فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں جو انقلاب برپا کیا اسکی عظمت مسلم ہے اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور وہ ہر زمانے کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی تکمیل کر دی اور ایک ایسا ضابطہ حیات پیش کیا جو ہر اعتبار سے مکمل ہے ۔ مگر مسلمانوں کے زوال کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ اقدار بھی مٹ گئیں جنھوں نے ایک زمانے میں انھیں عالم انسانیت کا مسلمہ قائد بنا دیا تھا ۔ مسلمان دوسروں کی رہبری کرنے کے بجائے انکی پیروی کرنے لگے ۔ اور رفتہ رفتہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ پس ماندہ اقوام میں شمار ہونے لگے مسلمانوں نے گزشتہ پانچ سو برسوں سے انسانی معاشرہ کو کچھ نہیں دیا ۔ غیر مسلم اقوام نے علوم و فنون میں جو ترقیاں کی ہیں اور مختلف طریقوں سے انسان کی بہبود کے لئے جو کام کیا انکے پیش نظر وہ یقیناً مسلمانوں سے بہتر ہیں ۔ وہ اسلام کے پیرو نہ سہی انسانیت کی خدمت تو کر رہے ہیں ۔ مسلمان تو مذہب سے بھی دور ہیں اور انسانیت کے لئے بھی بے مصرف ہیں ۔ ایسی اقوام کے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے جو انسانی معاشرہ کو کچھ دے نہ سکتی ہوں اور انسانیت کی کوئی خدمت نہ کر سکتی ہوں ۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ہر زمانے کے لئے ہے تو ہمیں یہ ثابت کرنے کے لئے اپنی اصلاح کرنی ہو گی اور دنیا کے سامنے خود کو نمونہ بنا کر پیش کرنا ہو گا ۔ اسلام یقیناً مکمل ضابطہ حیات

ہے اور اسکی عظمت سے انکار نہیں ہو سکتا ۔ کوئی بھی مذہب یا فلسفہ اپنے ماننے والوں سے پہچانا جاتا ہے ۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کا بول بالا ہو تو اسلام کی صحیح اقدار کو زندہ کرنا ہمارا فرض اولین ہونا چاہیے ۔

سب سے آخر میں پرنسپل جناب حافظ منظورالحق عثمانی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے ۔ نظریہ پاکستان کی بنیاد اسلام ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے نوجوان اپنے آپ کو اسلامی سانچہ میں ڈھالیں تاکہ نظریہ پاکستان کی حفاظت ہو سکے اور پاکستان عالم اسلام کی خدمت کر سکے ۔

تقریباً بارہ بجے یہ پاکیزہ تقریب اختتام پذیر ہوئی ۔ ہماری دعا ہے کہ ہماری قوم کے نونہال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو مشعل راہ بنائیں اور اپنی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں ۔ عید میلاد کی تقریب یقیناً منانا چاہے مگر ہمارا کام ”نشستند و گفتند و برخاستند“ نہیں ہونا چاہے ۔ ایسی تقریبات کا مقصد تبھی حاصل ہوتا ہے جب ان میں کہی گئی باتوں پر عمل بھی کیا جائے ۔



